إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اپریل ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۱۶، شمارہ ۴ اپریل ۲۰۱۲ء/ جمادی الاول ۱۴۳۳ھ

مشمولات

جب باڑ باغ کو کھانے لگے ۲

○تعلیم و تربیت

دینی مدارس کے لیے نیا نصاب (۴) — مولانا حسین احمد مدنیؒ ۴

تعلیم کا مسئلہ-حقائق کیا ہیں؟ — پروفیسر ملک محمد حسین ۱۱

پنجاب میں تعلیم کو غیر اسلامی بنانے کی کاوشیں — ڈاکٹر محمد شریف نظامی ۱۹

تعلیمی ادارے یا کاروباری سپر سٹور — عبدالرشید ارشد ۲۲

○پاکستانیات

پاکستان کا مستقبل - سیکولر یا اسلامی؟ — ڈاکٹر محمد امین ۲۵

بسلسلہ عمران خاں کا کردار

○ہمارا دینی تناظر

بڑھتی ہوئی فرقہ واریت-ذمہ دار کون ہے؟ — میر افسر امان ۳۰

○تزکیۂ نفس

تزکیۂ نفس میں نوافل کا کردار — احمد جاوید ۳۷

○اسلام اور مغرب

سائنسی علمیت اور اسلام (۲) — پروفیسر زاہد صدیق ۴۰

○استفسارات

کیا مغربی سائنس وٹیکنالوجی کے بغیر ترقی ممکن ہے؟ — مدیر ۵۳

○بزم قارئین

محمد ارشاد مغل، آفتاب عروج، سردار عالم خاں — ادارہ ۵۶

○تبصرہ کتب

ہماری تعلیمی زبوں حالی-اسباب اور تدراک — مدیر ۶۴

جب باڑ باغ کو کھانے لگے

ایک صاحب نے کہا: امریکہ ہمارے قبائلی علاقہ میں ڈرون حملے کر رہا ہے۔ امریکی مدد سے بھارتی بلوچستان میں مسلح مداخلت کر رہے ہیں۔ ملک ٹوٹ رہا ہے، معاشرہ بکھر رہا ہے، بے گناہ مر رہے ہیں۔ فوج کھڑی دیکھ رہی ہے، سیاسی حکمران ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پارلیمنٹ امریکہ کو یہ اجازت دینے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے کہ امریکی اور نیٹو پاکستانی راستوں سے اسلحہ و بارود افغانستان لے جائیں اور وہاں سے ہمارے خلاف استعمال کریں۔ اور بے چارے عوام کیا کریں؟ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔ لوڈ شیڈنگ، بے روزگاری اور مہنگائی نے ان کی زندگی عذاب کر رکھی ہے۔

دوسرے نے جواب دیا: جب باڑ باغ کو کھانے لگے تو ڈکشنری میں الفاظ کے معنی بدل دینے چاہئیں مثلاً اب آپ غلامی، وطن فروشی، بے غیرتی اور بے حسی کے معنی بدل دیں تو آپ کی مشکل حل ہو جائے گی۔

نرم دلی

پولیٹیکل سائنس کے استاد نے کلاس سے پوچھا کہ زرداری صاحب کو تو خیر استثناء حاصل ہے کہ جو کرتوت وہ چاہیں کریں لیکن رحمن ملک صاحب، احمد مختار صاحب اور کیانی صاحب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ایک طالب علم: ان کا کردار آئین میں بھی واضح ہے اور اخبارات سے بھی۔

دوسرا: جناب! وہ امریکہ کے آدمی ہیں۔

تیسرا: نہیں، وہ بھارت کے آدمی ہیں۔

چوتھا: یہ غلط ہے، وہ صرف پیسے کے آدمی ہیں، جو قیمت زیادہ لگا دے۔

استاد: لیکن آپ یہ بات کیانی صاحب کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتے؟

طالب علم: آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب۔ بس وہ ذرا نرم دل آدمی ہیں خون خرابہ نہیں چاہتے، ورنہ ڈرون گرانا کون سی بڑی بات ہے؟

اگلے الیکشن

چند سیاسی تجزیہ کار ایک محفل میں جمع تھے اور پاکستان کا اگلا الیکشن زیر بحث تھا:

ایک: اگلا الیکشن تحریک انصاف جیتے گی اور کرپشن کے خلاف اس کا سونامی سب کو بہا لے جائے گا۔

دوسرا: اگلے الیکشن میں دینی جماعتیں اہم کردار ادا کریں گی اور اسلامی انقلاب کی منزل قریب تر آ جائے گی۔

تیسرا: اگلا الیکشن مسلم لیگ جیتے گی کیونکہ وہی ملک کے مسائل حل کر سکتی ہے۔

چوتھا: میری حتمی رائے یہ ہے کہ اگلا الیکشن پیپلز پارٹی جیتے گی اور اپنے اتحادیوں کی مدد سے وہی حکومت بنائے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ گیم اگرچہ امریکہ ہی کی ہے۔ دینی جماعتوں میں انتشار کا سبب وہی ہے۔ تحریک انصاف کو بطور متبادل کھڑا کرنے والا بھی وہی ہے۔ مسلم لیگ بھی اس کی وفادار ہے لیکن زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ پیپلز پارٹی البتہ اپنے اتحادیوں سمیت امریکی اسکیم کے مطابق اور اس کے اطمینان کی حد تک یہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے کہ پاکستان کے مسائل بڑھتے رہیں یہاں تک کہ اقوام متحدہ کے ذریعے اسے ناکام ریاست قرار دلوایا جا سکے اور اس کے ایٹمی پروگرام کو 'حفاظت میں لیا جا سکے' لہٰذا اگلے الیکشن وہی جیتے گی۔

ہماری عظیم عدلیہ

ایک وکیل: پاکستان میں موجودہ اعلیٰ عدلیہ نے جتنا جاندار کردار ادا کیا ہے اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

دوسرا وکیل: آپ صحیح کہتے ہیں، وہ 'گریٹ گیم' میں اپنا کردار بطریق احسن ادا کر رہی ہے کہ پریشر ککر میں اسٹیم جمع نہ ہونے دو بلکہ وقفے وقفے سے اسٹیم نکالتے رہو تا کہ یہ پھٹ نہ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے چار سال میں کوئی بھی 'فیصلہ کن' فیصلہ نہیں آیا اور آئندہ بھی اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ یہ ہاتھی کے دانت ہیں جو کھانے کے کام نہیں آتے۔

دینی تعلیم

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

دینی مدارس کے لیے نیا نصاب (۴)

اصول نصاب درجہ ابتدائیہ

۱۔ بچوں کو پانچ برس کی عمر سے پہلے داخل نہ کیا جائے۔

۲۔ ایک عمر کے بچوں کی بحسب عمر جماعت بندی کی جائے یعنی پانچ سے سات برس کی عمر والوں کی ایک جماعت ہو اور سات سے نو تک کی دوسری جماعت ہو اور علی ہذا القیاس نو سے گیارہ تک کی ایک جماعت ہو۔ یہ تقسیم ہر سال کے بچوں میں ہونی چاہیے۔

۳۔ ہر جماعت کے بچے اگر ایک ہی درجہ میں پڑھتے ہوں تو علیحدہ علیحدہ رکھے جائیں، ان کو آپس میں مخلوط نہ ہونے دیا جائے۔

۴۔ چھوٹے بچوں کو ابتداءً مکتب کے تقید کا عادی بنایا جائے اور نہایت نرمی سے ان کو پڑھایا جائے۔

۵۔ ابتدائی سال میں تعلیم فقط چار گھنٹہ دی جائے البتہ اگر بچے سمجھدار اور عمر والے ہوں تو ان کو تعلیم چھ گھنٹہ دی جائے اور اگر وسط سال میں وہ اس قابل ہو جائیں کہ سال ثانی میں داخل ہو سکیں تو مقامی مدرس ان کی ترقی دیکھ کر سال ثانی میں داخل کر دے۔

۶۔ بچوں کا امتحان ہر ششماہی میں لیا جائے اور سمجھدار ذکی الطبع لڑکوں کو جلد جلد ترقی کا موقع دیا جائے۔ ان کی عمر سال بھر کی تعلیم کے لیے ضائع نہ کر دی جائے۔

۷۔ جو بچے کم سنی یا بلادت کی وجہ سے جلد ترقی نہیں کر سکتے ان کو بجائے تین سال حسب حیثیت زیادہ مدت مکتب میں خرچ کرنی ہوگی۔

۸۔ مدرسوں پر لازم ہے کہ بچوں پر ہمیشہ سختی نہ کیا کریں بلکہ ان کو رتبہ وغیرہ کا لالچ دے کر تعلیم و تعلم کا خوگر اور محنت و مشقت کا عادی بنایا جائے۔

۹۔ بچوں کو روزانہ پریڈ کی مشق کرائی جائے تاکہ ان کی صحت محفوظ رہے اور اس وجہ سے ان کے قلوب پر پڑھنے اور تقید کا اضمحلال نہ پڑے اور قواعد اجتماعی و جنگی کی مہارت ہو۔

۱۰۔ یہ پریڈ اردو یا صوبہ کی زبان میں ہونی چاہیے۔

۱۱۔ قواعد (پریڈ) روزانہ درمیانی مدت میں ہونی چاہیے۔

۱۲۔ بچوں کونماز جماعت جمعہ وغیرہ کی عملی تعلیم بھی ہونا ضروری ہے۔جس وقت نماز ظہر کی تعطیل ہوا کرے یا دینیات کے گھنٹہ میں ان کو یہ مشق کرائی جائے۔

۱۳۔ بچوں کوصوبہ کی زبان اوراردو پڑھاتے ہوئے تختی (لوح) پر لکھنے کی ابتدا ہی سے مشق کرانی چاہیے تا کہ جلد ترقی کرسکیں۔

۱۴۔ بچوں کوحساب اور گنتی صوبہ کی زبان میں سکھانا چاہیے۔

۱۵۔ جغرافیہ اورنقشہ بھی اگر صوبہ کی زبان میں پایا جائے تو اسی میں سکھایا جائے۔

اصول مخصوصہ نصاب تعلیم ثانوی (جونیئر) مکتب رشیدیہ

۱: اس مکتب میں مقدار تعلیم ۳۶ گھنٹہ رکھی گئی ہے۔

۲: انگریزی کی مفید کتابیں حسب انتخاب ماسٹر جاری کی جائیں گی۔

۳: انگریزی، بنگلہ اور اردو زبانوں کی تعلیم میں مدرسین کو چاہیے کہ اس کے گھنٹہ میں املاء اور کتابت بھی سکھائیں۔

۴: فارسی میں اردو سے ترجمہ کرنا اوراسی طرح بنگلہ سے اردواور فارسی سے ترجمہ کرنا بھی سکھلایا جائے۔

۵: سال ثالث اور اس کے بعد سے انگریزی میں بھی اردو اور بنگلہ سے ترجمہ اور تحریر کرائی جائے۔

۶: سال ثانی سے بنگلہ زبان میں مضمون (آرٹیکل) لکھا جائے اور تقریر بنگلہ کی مشق شروع کی جائے۔

۷: سال رابع سے اردو میں آرٹیکل لکھائے جائیں اور تقریر اردو کی مشق کرائی جائے۔

۸: سال خامس میں انگریزی کے مختصر مختصر آرٹیکل لکھائے جائیں اور تقریر انگریزی کی مشق کرائی جائے۔

نصاب درجہ ابتدائی (مکتب)

مقدار زمانی	دروس	کیفیت اور کتب دروس کے ملنے کی جگہ	اوقات ہفتہ وار
سال اول سال اوّل (الف)	قاعدہ عربی معہ نصف پارہ عم معہ تجوید عملی۔ قاعدہ بنگلہ اور پہلی کتاب بنگلہ (مکتب برنا شکھا) مصنف مزمل حق صاحب۔ گنتی لکھنا اور یاد کرنا وضو اور نماز عملی پریڈ	اس درجہ میں تعلیم فقط ۴ گھنٹہ روزانہ ہوگی اور ایک گھنٹہ روزانہ عملی دینیات اور پریڈ میں صرف کیا جائے۔	عربی ١٢ گھنٹہ، بنگلہ ٦ گھنٹہ، گنتی و حساب ٦ گھنٹہ، دینیات عملیہ ٣ گھنٹہ، پریڈ ٣ گھنٹہ
سال اول (ب)	بقیہ پارہ عم و الم معہ تجوید عملی، قاعدہ تعلیم الاسلام اور تعلیم الاسلام حصہ اول معہ کتابت۔ مکتب ریڈر بنگلہ حصہ اول مصنفہ تفضّل حسین صاحب معہ کتابت گنتی اور پہاڑے دس تک۔ نماز کی عملی تعلیم پریڈ۔	تعلیم الاسلام اور قاعدہ مصنفہ مولانا کفایت اللہ صاحب از کتب خانہ رحیمیہ، سنہری مسجد دہلی۔ اس درجہ میں تعلیم ۵ گھنٹہ روزانہ ہوگی۔ نماز کی عملی تعلیم نماز کے وقت کی تعطیل میں ہوگی۔	عربی ٩ گھنٹہ، اردو و دینیات ٦ گھنٹہ، بنگلہ ٦ گھنٹہ، حساب ٦ گھنٹہ، نماز کی عملی تعلیم ٣ گھنٹہ، پریڈ ٣ گھنٹہ۔

سال ثانی	پارہ سیقول تا نصف قرآن۔ تعلیم الاسلام حصہ دوم۔ اردو کی پہلی کتاب معہ کتابت۔ بنگلہ کی تیسری کتاب (مکتب ریڈر ۲) جمع، تفریق، ضرب، تقسیم بسیط رسالہ ہمارے نبیؐ۔ پریڈ۔	رسالہ ہمارے نبیؐ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملتا ہے۔ دینیات کے وقت میں تعلیم الاسلام حصہ دوم اور رسالہ ہمارے نبیؐ اور نماز کی عملی تعلیم ہونی چاہیے۔	عربی ۹ گھنٹہ، بنگلہ ۶ گھنٹہ، دینیات ۶ گھنٹہ، حساب ۶ گھنٹہ، اردو ۴ گھنٹہ، پریڈ، ۳ گھنٹہ
سال ثالث	بقیہ قرآن شریف معہ تکرار قرآن۔ رسالۂ جمال القرآن درتجوید۔ تعلیم الاسلام نمبر ۲ و ۴ اردو کی دوسری اور تیسری کتاب معہ املاء و کتابت۔ بنگلہ کی چوتھی کتاب (مکتا پار) مصنف افضل النساء۔ خاتون معہ املاء و کتابت۔ جمع تفریق ضرب بسیط و مرکب جغرافیہ صوبہ، خاتم الانبیاء، پریڈ۔	۱۔ جغرافیہ صوبہ کی زبان میں ہونا چاہیے۔ ۲۔ یہ رسالہ کتب خانہ دارالاشاعت دیوبند ضلع سہارنپور سے ملتا ہے۔	عربی معہ تجوید ۷ گھنٹہ۔ دینیات معہ سیرۃ ۹ گھنٹہ۔ اردو ۶ گھنٹہ، حساب ۶ گھنٹہ، جغرافیہ ۳ گھنٹہ، پریڈ ۳ گھنٹہ۔

نصاب تعلیم ثانوی (جونیئر) مکتب رشدیہ مدت تعلیم ۵ سال

مقدار زمانی	کتب درسیہ	تقسیم اوقات ہفتہ	کیفیت ومواقع کتب

سال اول	ترجمہ قرآن شریف حضرت شیخ الہند مرحوم ۵ پارہ ابتدائیہ، رسالہ علم الفقہ نمبر ا و ۲ تا نصف مصنفہ مولوی عبدالشکور صاحب، رحمۃ للعالمین جلد اوّل، فارسی کی پہلی کتاب معہ وبستان دانش، مصدر فیوض تا مصادر، جغرافیہ ہند معہ مشق نقشہ۔ بنگلہ کی پانچویں کتاب (سول سہاتھا) مصنفہ قاضی امداد الحق صاحب معہ تحریر کنگ پرائمر و فسٹ ریڈر انگریزی۔ مقسوم علیہ اعظم و ذواضعاف اقل وغیرہ۔ قواعد اردو نمبر ا، ۲ مصنفہ منشی محمد اسماعیل میرٹھی۔ نقشہ نویسی ظروف، (ڈرائنگ) مسدس حالی اورنگزیب مصنفہ شبلی نعمانی برائے مطالعہ۔	ترجمہ قرآن شریف ۳ گھنٹہ، دینیات ۳ گھنٹہ، سیرۃ و تواریخ ۳ گھنٹہ، فارسی ۵ گھنٹہ، جغرافیہ ۳ گھنٹہ، بنگلہ ۳ گھنٹہ، انگریزی ۳ گھنٹہ، حساب ۳ گھنٹہ، اردو معہ قواعد و تحریر ۲ گھنٹہ، نقشہ نویسی ۲ گھنٹہ، دستکاری ۲ گھنٹہ۔	۱۔ رسالہ علم الفقہ دفتر النجم لکھنو سے ملتا ہے۔ ۲۔ رحمۃ للعالمین مصنف قاضی سلیمان صاحب دفتر الناظر بک ایجنسی لکھنو سے ملتی ہے۔ ۳۔ قواعد اردو نمبر ا و ۲ مطبع نولکشور لکھنؤ سے ملتی ہے۔ ۴۔ الناظر بک ایجنسی لکھنو سے ملے گا۔
سال ثانی	ترجمہ قرآن شریف ۱۰ پارہ، علم الفقہ نمبر ۲، ۳، تاریخ الامہ نمبر ۲۔ عرب قبل از اسلام مصنفہ شرر، فارسی کی دوسری اور تیسری کتاب۔ بقیہ مصدر فیوض معہ تحریر، جغرافیہ ایشیا معہ مشق نقشہ، (سہاتھا کسوم) مصنفہ سعادت علی خان معہ تحریر۔ انگریزی سیکنڈ ریڈر معہ کتابت، کسور اشاریہ و اربع متناسبہ، سفینہ اردو، آئین اردو ثلث اول، نقشہ نویسی اشجار، دارالمطالعہ (حیاۃ سلطان صلاح الدین) مصنفہ حکیم احمد حسین الہ آبادی برائے مطالعہ۔	ترجمہ قرآن شریف و فقہ ۳، ۳ گھنٹہ، جغرافیہ و تاریخ فارسی ۴، ۵ گھنٹہ، بنگلہ وانگریزی ۴، ۶، حساب، اردو معہ قواعد ۳، ۴، نقشہ نویسی ا، گھنٹہ دستکاری ۲ گھنٹہ، دارالمطالعہ ایک گھنٹہ۔	۱۔ عرب قبل از اسلام مصنفہ شرر لکھنوی، جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی۔ ۲۔ سفینہ اردو جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی۔ ۳۔ آئین اردو مصنفہ مولوی زین الدین فرجاد، نامی بک ڈپو میرٹھ محلہ اندرکوت۔ ۴۔ الناظر بک ایجنسی لکھنو سے ملتا ہے

سال ثالث	ترجمہ قرآن شریف تا پارہ ۲۵ ،علم الفقہ ۴، ۵ عقائد اسلام حقانی مصنف۔ تاریخ الامہ نمبر ۳،گلستان یا چوتھی کتاب فارسی، جغرافیہ طبعی (سائنس جدید)، ادبیات بنگلہ (پرااوند۔ ا مالا) مصنفہ قاضی امدادالحق صاحب۔ انگریزی ریڈر ۳ جغرافیہ عمومیہ معہ نقشہ سنہ۔ ۴،تناسبہ وسود ومتی کاٹا وغیرہ۔ مساحت، معارف ملت مضامین الکلام ۱، ۲ آئین اردو حصہ ثالث متوسط۔ نقشہ نویسی عمارات۔ رسالہ علم الصرف نمبر ا و ۲ مصنفہ مولوی مشتاق احمد صاحب وعربی صفوۃ المصادر، مصنفہ مولوی اشفاق احمد صاحب	ترجمہ قرآن شریف ۳ گھنٹہ، دینیات ۳، بنگلہ ۳، تاریخ و جغرافیہ ۴، انگریزی ۴، حساب و مساحت ۴، اردو قواعد اردو، ۳ نقشہ نویسی ۲، صرف عربی ۳ فارسی ۳، دارالمطالعہ ۱، دستکاری ۲ گھنٹہ	۱۔ عقائد اسلام مصنفہ مولوی عبدالحق مرحوم مؤلف تفسیر حقانی کتب خانہ رحیمیہ سنہری ،مسجد دہلی، جغرافیہ طبعی یعنی جدید میں ماسٹر بنگلہ یا صوبہ کی زبان کی کتاب کو پڑھانے یا اردو میں اس کی کتاب کو جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے طلب کرے۔ ۳۔ معارف ملت اور مضامین ابوالکلام اور جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی۔
	(تاریخ الحریۃ فی الاسلام) از منشی محمد الدین فوق بطور مطالعہ داخل نصاب ہوگی۔		۳۔ حساب اور مساحت میں صوبہ کی زبان میں کتابیں پڑھائی جائیں۔ ۵۔رسالہ علم الصرف وعربی صفوۃ المصادر مولوی اشفاق احمد صاحب، چرتھاول ضلع مظفرنگر سے طلب کی جائے۔ ۶۔ الحریہ فی الاسلام جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی یا الناظر بک ایجنسی لکھنو سے۔

سال رابع	بقیہ ترجمہ قرآن شریف وموضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم ومغفور ثلث اول، درایۃ الادب و مدارج القرأۃ، ادبیات بنگلہ (پراوندارتنامالا) مصنفہ سود کھنارائے، تاریخ الامہ ۴، رسالہ علم الصرف وصرف میر۔ سائنس اور اسلام نصف اول۔ بقیہ عقائد حقانی، انگریزی ریڈر ۴ معہ املاء و کتابت ۔ نحومیر و اجرومیہ و (سلم الدروس العربیۃ لطفلانینی) تیسیر المنطق، اردو رسالہ علم الفقہ ۶، آئین اردو ثلث اخیر۔ کلام جوہر واقبال، کنگال ہندوستان، الفاروق مصنفہ شبلی مرحوم بطور مطالعہ داخل نصاب ہے۔	ترجمہ قرآن شریف ۳، دینیات عقائد ۳، بنگلہ ۳، تاریخ واقتصادیات، ۴، سائنس ۲، انگریزی ۴، نحو ۴، صرف ۴، منطق ۲، اردو معہ قواعد ۳، دارالمطالعہ ۱، دستکاری ۲ گھنٹہ	۱۔ سائنس اور اسلام کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد دہلی۔ ۲۔ اجر ومیہ وسلم الدروس العربیۃ بھنڈی بازار ۹، مکتبہ شرف الدین ۲، ۳۔ تیسیر المنطق خانقاہ اشرفیہ، تھانہ بھون ۴۔ کلام جوہر واقبال جامع ملیہ قرول باغ ۵۔ کنگال ہندوستان، دامن اینڈ کمپنی، لوہاری دروازہ، لاہور ۶۔ الفاروق، الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے ملتی ہے۔

سال خامس	بقیہ موضح القرآن، دروس الادب نمبر ۱، ۲ شرح اجرومیہ والدروس العربیہ نمبر ۱ و ۲ لغلا نینی، تاریخ سند قدیم تاریخ الامہ نمبر ۵، دستور المبتدی۔ مراح الارواح۔ ایسا غوجی قال اقول مرقات مظلوم کسان، دیوان غالب، ادبیات انگریزی، مساحت اقلیدس مقالہ اول، ادبیات بنگلہ،سوبھا گو سوپہاں، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز و سیرۃ النعمان (رحمهما الله تعالیٰ) کتب مطالعہ ہیں۔	قرآن ۳، ادبیات عربی ۳،نحو ۶،صرف ۶، منطق ۳، انگریزی ۳، بنگلہ ۲، اردو ۲، دارالمطالعہ ۱، دستکار ۲، تاریخ واقتصادیات ۳، مساحت و اقلیدس ۲ گھنٹہ۔	۱۔ دروس الادب مولفہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۲۔شرح اجرومیہ والدروس العربیہ بھنڈی بازار بمبئی والد غلام محمد سورتی کے یہاں ملتی ہے۔ ۳۔تاریخ ہند قدیم جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملتی ہے۔ ۴۔مظلوم کسان ورمن اینڈ کمپنی لوہاری دروازہ لاہور سے ملتی ہے۔ سیرۃ عمر قمر بن عبدالعزیز اور سیرۃ النعمان جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی یا الناظر بک ایجنسی لکھنو سے ملتی ہیں۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

جب آدمی دین، حیا اور غیرت سے جاتا ہے تو عقل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی تازہ اور زندہ مثال یہ ہے کہ ایک نام نہاد مسلمان عورت (شرمین چنائے) جو مغرب میں رہتی ہے' مغربی ایجنسیوں کے پیسے سے اسلام، پاکستان اور مجاہدین کے خلاف فلمیں بناتی ہے۔ اسے اہل مغرب اس کی 'شاندار' فلموں کی بناء پر ایوارڈ سے نوازتے ہیں۔ پاکستان کا غلام الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اس کے گن گاتا ہے۔ غلام حکمران اسے تمغوں سے نوازتے ہیں' ساری قوم اسے سر پہ بٹھاتی ہے اور نوجوان اس کی نیم عریاں تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ لعنت ہو اس غلامی پر جو عقل کو بھی ماؤف کر دیتی ہے۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم کا مسئلہ ۔ حقائق کیا ہیں؟

تعلیم کا بین الاقوامی تناظر

تعلیم کے بین الاقوامی تناظر کو سمجھنے کے لیے چند بنیادی نکات کی نشاندہی کی جاتی ہے جو عالمی سطح پر نمایاں ہیں:

۱۔ دنیا بھر میں کالونائزیشن (Colonization) اور گلوبلائزیشن (Globlization) کا ایجنڈا یہ ہے کہ اشخاص، اشیاء اور خدمات کو ایسی کموڈیٹی (Commodity) یعنی جنس بنا دیا جائے جو منڈی میں قابل خرید وفروخت ہو۔

۲۔ تعلیم و تربیت اور اذہان و رجحانات کی تبدیلی کے لیے میڈیا ایک وسیع اور مؤثر کلاس روم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کارپوریٹ کلچر کے زیر اثر میڈیا کا مقصد یہ ہے کہ وہ آپ کو بے وقعت (Disempower) کر دے تاکہ آپ جامد اور مفلوج ہو جائیں اور محسوس کریں کہ کوئی سماجی تبدیلی جو آپ چاہتے ہیں، ممکن نہیں ہے۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ باخبری ایک قوت ہے یعنی Information is Power اور میڈیا انفارمیشن بہم پہنچاتا ہے، اس لیے میڈیا عوام الناس کو (Empower) کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میڈیا فلٹرڈ (Filtered) انفارمیشن دیتا ہے جو سامراجی اور فسطائی قوتوں اور ان کی سرپرست ملٹی نیشنل کارپوریشنز کی مرضی اور منشا کو پورا کرتی ہے لہٰذا میڈیا طاقت دینے کی بجائے عوام الناس کو ناطاقتی کا شکار کرتا ہے۔

۴۔ جدید دنیا میں ظالم کے ہاتھ میں سب سے طاقتور ہتھیار مظلوم کا ذہن ہے، جسے استعمال کر کے وہ اُسے ظلم سہنے کا عادی بناتا ہے اور ایسا کرنا صرف تعلیم کے ذریعے ممکن ہے۔ کلاس روم کی تعلیم اور میڈیا کی تعلیم سے اسی ایجنڈے پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں عوام الناس کو اپنے اپنے ملک میں تین آزادیاں حاصل ہیں۔ پہلی بولنے کی آزادی، دوسری ضمیر کی آزادی اور تیسری دونوں آزادیاں استعمال نہ کرنے کی آزادی۔ یقین نہ آئے تو مختلف ممالک کے تحریری آئین اور اقوام متحدہ کا چارٹر پڑھ لیں اور پھر عملی زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھ لیں۔

۵۔ تعلیم و تعلم کے شعبے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ معلومات کے سمندر میں

غوطے کھا رہے ہیں لیکن علم کی پیاس نے سب کو بے حال کر رکھا ہے۔ رہ گئی العلم کی بات تو وہ درس و تدریس میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔

۶۔ گلوبلائزیشن کے تحت تعلیم کے ذریعے یہ یقینی بنانا ہے کہ تعلیمی ادارے سر جھکا دینے والے، نظریاتی طور پر مطیع انسان، سرمایہ دارانہ نظام کے خادم اور مؤثر کارکن پیدا کریں تا کہ سرمایے کی عالمی حکمرانی کو تقویت ملتی رہے۔

۷۔ گلوبلائزیشن کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں سرمایہ داروں کے لیے نفع اندوزی کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ پرائیویٹ سیکٹر کے تعلیمی ادارے، انٹرنیشنل ایجوکیشن، کراس بارڈر ایجوکیشن کی سہولیات، بین الاقوامی امتحانات اور اسی طرح کی دیگر عالمی سہولیات سے یہ امر بخوبی واضح ہے۔

۸۔ تعلیم میں سرمایہ داری کلچر کا حاصل یہ ہے کہ یہ نظام استاد کو ایک ٹیکنیشن کا درجہ دیتا ہے۔ مربی اور قائد ہونے کی حیثیت استاد سے چھین لی گئی ہے۔

۹۔ دورِ حاضر کی تعلیم نے آبادی کا ایک ایسا بڑا طبقہ پیدا کیا ہے جو پڑھ تو سکتا ہے لیکن یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ پڑھے جانے کے قابل کیا چیز ہے۔

۱۰۔ دورِ حاضر کی تعلیم میں اس سے بڑھ کر کوئی حیران کن چیز نہیں ہے کہ وہ جامد معلومات کی شکل میں جہالت اور جاہلیت کی ایک بڑی مقدار اذہان میں ٹھونس دیتی ہے۔

۱۱۔ گلوبل نظامِ تعلیم ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ اقوام کے غریبوں کو غریب تر بنا رہا ہے کیونکہ یہ غیر ترقی یافتہ دنیا کو مقامی وسائل استعمال کر کے ترقی کرنے کی بجائے ملٹی نیشنل کے صنعتی وسائل استعمال کر کے زندگی گزارنے کا سبق دیتا ہے۔

۱۲۔ گلوبلائزڈ نظامِ تعلیم نے جہاں طلبہ کی بین الاقوامی آمد و رفت میں اضافہ کیا ہے وہاں تہذیب وتمدن کے گلوبلائیز (Globalize) ہونے کے راستے بھی سہل بنائے ہیں جب کہ اس عمل میں فائدہ غالب اقوام کو ہوا ہے اور خسارہ زیر دست معاشرے اُٹھا رہے ہیں۔

گلوبلائزیشن کا عالمی کلچر اور اس کے تعلیمی مضمرات

گلوبلائزیشن کے عالمی کلچر میں حکومت سرمائے کی ہے۔ سرمایہ (Capital) دنیا کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے جو قرآنی اصطلاح **الھکم التکاثر** کے مصداق چاہتے ہیں کہ ان کے سرمایہ میں مسلسل اور لامحدود اضافہ ہو۔ سرمایہ میں اضافہ کی ایک ہی صورت ہوتی ہے کہ سرمائے سے کیے جانے والے کاروبار کا منافع بڑھے نیز منافع پر ترجیحاً ٹیکس نہ ہو اور اگر ایسا ناگزیر ہو تو ٹیکس کی شرح کم سے

کم ہو۔ٹیکسوں میں کمی تبھی ممکن ہے جب حکومتوں کے اخراجات کم ہوں۔اب حکومتوں کے اخراجات میں کچھ تو وہ ہیں جو اسٹیبلشمنٹ (Establishment) پر خرچ ہوتے ہیں لیکن یہ اخراجات کم نہیں ہوسکتے کیونکہ حکومت اسٹیبلشمنٹ کی ہوتی ہے۔اخراجات کی دوسری مدقومی ترقی اور سماجی خدمات کی مد ہے جن میں تعلیم ،صحت، سماجی بہبود، ازالۂ غربت اور رفاہِ عامہ کے شعبے آتے ہیں۔ یہ وہ مدیں ہیں جن میں کمی لائی جاسکتی ہے کیونکہ ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے عوام بے اختیار ہیں۔ان مدوں میں زیادہ کمی آسکتی ہے اگر تعلیم اور صحت کے اداروں کو حکومتی ذمہ داری سے نکال کر پرائیویٹ سیکٹر کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔ازالۂ غربت اور رفاہِ عامہ کے منصوبے کم سے کم سطح پر لائے جائیں یا ختم کر دیے جائیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں یہی کچھ ہورہا ہے۔سکول، کالج، یونیورسٹیاں اور ہسپتال پرائیویٹائز ہورہے ہیں۔قومی ترقی اور رفاہِ عامہ کے منصوبے بجٹ کٹوتی کا شکار ہورہے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے پاس تعلیم کے لیے دو پلان ہیں:

پہلا ہے Business plan for Education یعنی تعلیم کے لیے کاروباری منصوبہ

دوسرا ہے Business plan in Education یعنی تعلیم میں کاروباری منصوبہ

پہلے منصوبے کے تحت تعلیم کے ذریعے ایسے کارکن تیار کرنا مقصود ہے جو بزنس کے پھلنے پھولنے میں کارآمد ہوں اور ملٹی نیشنلز کے لیے تکنیکی، انتظامی اور مالیاتی مہارتوں کے حامل تعلیم یافتہ ورک فورس پیدا کریں۔اس منصوبے پر جب عمل درآمد ہوتا ہے توکم ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ اقوام کو دہرا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ایک تو یہ کہ مذکورہ اقوام اپنے نوجوانوں کو ملٹی نیشنلز کے ایجنڈے کے مطابق تعلیم دینے یا تعلیم دلانے میں کثیر سرمایہ خرچ کرتے ہیں جو عام طور پر ترقی یافتہ اقوام کی طرف چلا جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ چونکہ ملٹی نیشنلز کے ایجنڈے کے مطابق تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اپنے ممالک میں کھپت نہیں ہوتی لہٰذا وہ اپنی مہارتوں کے ہمراہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف ہجرت کرجاتے ہیں یا جہاں جہاں ملٹی نیشنلز کو ضرورت ہوتی ہے وہاں چلے جاتے ہیں اور اس طرح برین ڈرین (Brain Drain) یا ذہانت کے فرار سے کم ترقی یافتہ ممالک مزید غریب ہوجاتے ہیں۔دوسرے پلان کے ذریعے مقصد یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے بزنس کیا جائے اور تعلیم کے ذریعے سرمایہ اکٹھا کیا جائے۔ پاکستان میں سرمایہ داروں کی قائم کردہ یونیورسٹیاں، کالجز اور سکول سسٹمز، بین الاقوامی تعلیمی نمائشیں اور بیرونی یونیورسٹیوں میں داخلوں کا بزنس کرنے والی کنسلٹنگ کمپنیاں اس منصوبے کی واضح مثالیں ہیں۔نتیجہ اس کا یہ ہے کہ غریب عوام کے لیے قائم تعلیمی ادارے غریب تر اور بزنس کی بنیاد پر قائم تعلیمی ادارے امیر سے امیر تر ہورہے ہیں۔آگے بڑھ کر معاشرے میں جو اثرات مرتب ہورہے ہیں، ان کے مطابق غریب لوگ تو مزید غریب ہو ہی رہے ہیں۔متوسط طبقے کے لوگ بھی پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی لوٹ مار کی وجہ سے خطِ افلاس سے نیچے آرہے

ہیں نیز معاشرے کے ان طبقات میں جن کے پاس ناجائز طریقوں سے مال بنانا ممکن ہے ان میں بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کرپشن بڑھ رہی ہے خصوصاً چھوٹے اور متوسط درجے کے ملازمین اس قباحت کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔

تعلیم کا قومی تناظر

تعلیم کے قومی تناظر کو ہم پرائیویٹائزیشن، لبرالائزیشن، سیکولرائزیشن اور طبقاتیت کے نکات کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔ مذکورہ چاروں نکات گلوبلائزیشن کا براہِ راست نتیجہ ہیں:

پرائیویٹائزیشن (Privatization)

پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر پچھلی صدی کی اسی کی دہائی میں پھیلنا شروع ہوا اور اب تقریباً ۳۳ فیصد طلبہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جہاں ایک طرف پرائیویٹ تعلیمی سیکٹر پھیلا ہے۔ وہاں پبلک سیکٹر شاہد سکڑا تو نہ ہو لیکن وہ جمود کا شکار ضرور ہوا ہے۔ تعلیم کے بین الاقوامی تناظر کے تحت کی گئی بحث اور اس کے نتائج کے طور پر ہوا یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کے تعلیمی ادارے بھی پرائیویٹائزیشن کا شکار ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو صورتِ حال نظر آتی ہے اس کے مطابق:

☆ سرکاری سیکٹر میں نئے سکول اور کالج نہیں کھل رہے بلکہ بعض مقامات پر داخلہ کم ہو جانے کی وجہ سے سرکاری ادارے بند ہوئے ہیں۔

☆ سرکاری سکولوں کو اپ گریڈیشن کے نام پر پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت نجی انتظام میں دیا جا رہا ہے۔

☆ لامرکزیت کے نام پر کالجوں اور سکولوں کو بورڈ ز آف گورنرز کے تحت کر کے پرائیویٹائزیشن کی طرف رُخ کر لیا گیا ہے۔

☆ کالجوں میں کمپیوٹر کی تعلیم، پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے نام پر مکمل طور پر پرائیویٹ نفع خور ہاتھوں میں ہے۔

☆ پرائیویٹ یونیورسٹیوں اور انسٹی ٹیوٹس کو دھڑا دھڑ چارٹر دیے جا رہے ہیں۔

☆ پبلک سیکٹر یونیورسٹیاں بھی اب اپنے فیس پیکجز، آؤٹ سورسنگ Out Sourcing اور توسیعی پروگراموں کے حوالے سے پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔

☆ پرائیویٹ سیکٹر میں ملکی اور غیر ملکی سکول سسٹمز پھیلتے جا رہے ہیں۔ فرنچائز کے نام کے تحت

پرائیویٹ سیکٹر کے ادارے سیکنڈ جنریشن کی پرائیویٹائزیشن کو فروغ دے رہے ہیں اور اب تو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی فرنچائز ڈ سکولوں کی دوڑ میں شامل ہو گئی ہے۔

لبرالائزیشن (Liberalization)

گلوبلائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کا قدرتی نتیجہ لبرالائزیشن کا رجحان ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر اپنے فروغ اور دوسروں سے مقابلے کی خاطر لبرالائزیشن کا سہارا لیتا ہے جس میں اقدار، اصول اور معیار ذبح ہوتے ہیں اور ہر وہ قدم جائز شمار ہوتا ہے جس سے کاروبار کو فروغ اور نفع اندوزی میں اضافہ ہو۔ لبرالائزیشن کے رجحان کے تحت:

☆ تعلیم کا شعبہ فری فار آل (Free for all) ہو چکا ہے۔

☆ نصاب، کتاب، امتحان اور معیارِ تعلیم پر سٹیٹ کنٹرول مسلسل پسپائی کا شکار ہے۔ اب آئین میں کنکرنٹ لسٹ ختم ہونے اور نصاب، درسی کتب اور معیاراتِ تعلیم کے معاملے میں صوبوں کو منتقل ہونے سے صورتِ حال مزید بدحالی کا شکار ہو گئی ہے۔

☆ اسلامی نظریاتی تشخص اور نظریاتی تربیت کے حوالے سے تعلیمی اداروں کا ماحول روز بروز معاندانہ ہوتا جا رہا ہے۔

☆ مخلوط تعلیم اب ہوتے ہوتے ثانوی سکولوں اور کالج کی سطح تک پہنچ چکی ہے حالانکہ اس سطح پر مخلوط تعلیم قانوناً ممنوع اور اخلاقی حوالوں سے تباہ کن ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب امریکی سکولوں کی طرح پاکستان میں بھی واش رومز میں کنڈوم اور دیگر مانع حمل اشیاء رکھنا پڑیں گی۔

☆ طلبہ کو بیرونی امتحانوں میں بٹھانے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور قوم کا قیمتی زرمبادلہ اربوں روپوں کی شکل میں بیرون ملک جا رہا ہے۔

سیکولرائزیشن (Secularization)

گلوبلائزیشن، لبرالائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کا بدیہی نتیجہ سیکولرائزیشن ہے۔ پاکستان جیسا نظریاتی ملک جہاں تعلیمی اداروں اور تمام عناصر تعلیم کو اسلامی نظریاتی رنگ میں رنگا ہونا چاہیے وہاں مغربیت کا رنگ نمایاں ہو رہا ہے۔ طلبہ کا لباس، ہم نصابی سرگرمیاں، اداروں کا ماحول اور تعلیمی اداروں میں زندگی گزارنے والے افراد کے باہمی تعلقات سب کے سب مغربیت زدہ ہو گئے ہیں۔ یونیورسٹی کیمپسز کا ماحول اور خصوصاً اشرافیہ کے سکولز اور کالجز کا ماحول کسی بھی یورپین اور امریکن تعلیمی ادرے سے مختلف نہیں ہے۔

طبقاتیت (Class Disparity)

تعلیم کے شعبہ میں بدترین طبقاتیت فروغ پا رہی ہے۔ تعلیمی اداروں کی اقسام جو ماضی میں دو تین درجوں میں بانٹی جاسکتی تھیں اب درجن بھر طبقوں میں بٹ چکی ہیں۔

بڑی تقسیم تو ہے، دینی تعلیمی ادارے اور عصری یا جدید تعلیم کے ادارے۔

دینی تعلیمی اداروں میں مسلکی تقسیم کی بنیاد پر کم از کم پانچ قسم کے تعلیمی ادارے تو اظہر من الشّمس ہیں جو پانچ امتحانی وفاقوں سے منسلک ہیں۔ دینی تعلیمی اداروں میں پانچ امتحانی وفاقوں سے منسلک تعلیمی اداروں کے علاوہ بھی کچھ مختلف شیڈز کے ادارے موجود ہیں جو شاید بہت نمایاں نہ ہوں لیکن اپنا اپنا طبقہ وہ بھی پیدا کر رہے ہیں (جیسے مثلاً تبلیغی جماعت کے دینی مدارس)۔

جدید یا عصری تعلیم کے ادارے سرکاری، نیم سرکاری، فوجی، اور غیر سرکاری تقسیم کے علاوہ فیسوں کی سطح کے لحاظ سے بھی کئی طبقوں میں تقسیم ہیں۔ ۱۰۰ روپے سے لے کر ۲۵، ۳۰ ہزار روپے مہینہ تک کی فیس کے ادارے وجود میں آ چکے ہیں۔ ایسے اداروں کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے جو فیس روپوں کی بجائے ڈالروں میں لیتے ہیں۔ ایک طرف وہ ادارے ہیں جو مقامی امتحانوں کے لیے طلبہ کو تیار کرتے ہیں اور دوسری طرف ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ادارے ایسے ہیں جو بیرونی امتحانات کی تیاری کراتے ہیں۔ ان میں برٹش، جرمن، فرنچ، امریکن اور کینیڈین ...... سسٹم کے ادارے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں کم وسیلہ اور بے وسیلہ بچوں کے لیے محض اپنی ذہانت اور محنت کی بنیاد پر آگے بڑھنا ممکن نہیں رہا۔

تعلیم پر حکومتی مصارف اور گورننس کے مسائل

اگر سال بہ سال تعلیمی بجٹ، روپے کی قدر اور افراطِ زر کا جائزہ لیا جائے تو تعلیم پر حکومتی مصارف میں کمی آ رہی ہے۔ اس وجہ سے سرکاری سیکٹر کے تعلیمی ادارے روبہ زوال ہیں۔ کاسمیٹک اقدامات اور سلوگنزم پر مبنی منصوبے تو بہت ہیں لیکن بدانتظامی، کام چوری، فنڈز کے ضیاع اور تعلیم کے گرتے ہوئے معیار پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی ہزاروں خالی آسامیاں اور تعلیمی تدریسی سازوسامان کی کمی تعلیمی بجٹ ناکافی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

تعلیمی اداروں میں قانون اور نظم وضبط کی حکمرانی تقریباً مفقود ہے۔ تعلیم کے شعبہ میں اصل راج سول بیوروکریسی کا ہے جس کی غلط پالیسیاں تعلیمی شعبے میں انتشار اور تباہی کا باعث ہیں۔ تعلیمی منتظمین کا صوبے سے لے کر سکول و کالج کے سربراہ تک ایک مربوط سلسلہ موجود ہے لیکن اختیار اور فیصلہ سازی کی قوت سے یک سر محروم۔ شعبہ تعلیم کی حقیقتوں سے بے خبر، آنسو گیس اور لاٹھی چارج کی مہارتوں سے لیس

سول بیوروکریسی کا ایک ناتجربہ کار فرد صوبائی سیکرٹری تعلیم کی حیثیت میں فیصلے کرتا ہے، پالیسیاں بناتا ہے اور پورا محکمہ تعلیم بشمول اساتذہ اور طلبہ اسے بھگتتے ہیں۔

این جی اوز اور فارن ڈونرایجنسیوں کی مداخلت

این جی اوز اور بیرونی امدادی اداروں کی مداخلت بہت بڑھ گئی ہے۔نصاب اور تربیت اساتذہ پر یو ایس ایڈ، جرمنی کی جی ٹی زیڈ، برطانیہ کی ڈی ایف آئی ڈی (DFID) اور اسی طرح کے دیگر یورپین ملکوں کا مکمل کنٹرول ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ یہ بیرونی امدادی ادارے اپنی مرضی کی تبدیلی لانے کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہیں۔ دہشت گردی کو کنٹرول کرنے کے نام پر اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تعلیم (دینی اور دنیوی) پر بیرونی کنٹرول بڑھے گا۔سول بیوروکریسی اس سلسلہ میں بھی فعال کردار ادا کر رہی ہے۔ بیرونی ایجنسیوں کے مقامی اہل کار کئی شکلوں میں کام کر رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ تعلیم کا شعبہ اہلِ تعلیم کی بجائے سول بیوروکریسی کے تصرف میں ہے اور سول بیوروکریسی بیرونی امدادی اداروں کے کھونٹے سے بندھی ہے۔سیاسی حکومتوں کے وزرائے تعلیم بس شوبوائے ہیں جو ذہانت اور فکر کے لحاظ سے تیسرے درجے کے لوگ ہیں۔ وزراء کرام بیوروکریسی کے محتاج اور بیوروکریسی بیرونی ایجنٹوں کی آلہ کار ہے۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

ہم سے ہماری مراد وہ تمام سیاسی، دینی اور تعلیمی قوتیں ہیں جنہوں نے اپنے اوپر محبِ اسلام اور محبِ وطن ہونے کا لیبل لگا رکھا ہے اور اپنے اس لیبل کے ساتھ مخلصانہ نباہ کے لیے تگ ودَو بھی کرتی ہیں:

۱۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے پاس تعلیم کی دنیا کی تاثراتی معلومات تو ہیں لیکن ایسی ٹھوس معلومات اور حقیقی اعداد و شمار نہیں ہیں جن کی بنیاد پر ہم کوئی معقول فیصلہ سازی کرتے ہوئے قوم کے لیے مربوط تعلیمی لائحہ عمل بنا سکیں۔ اکثر صورتوں میں تو ہم خود بھی اسی بہاؤ کا حصہ ہیں جس نے تعلیمی شعبے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اگرچہ لیبل کی حد تک ہم نے کمپرومائز (Compromise) نہیں کیا۔

۲۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پرائیویٹ ایجوکیشن سسٹم میں اسلام اور نظریہ پاکستان سے اخلاص رکھنے والے مالکان کا حصہ ۱۰ سے ۱۵ فیصد تک ہے۔اس ۱۰ سے ۱۵ فیصد حصہ میں ایسے پُرجوش حلقوں کی تعداد ۲۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہوگی۔ جو لبرل ازم اور سیکولرازم سے شعوری طور پر بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ اسلام کا انسان مطلوب اور جدید دنیا میں اسلامی معاشرے کے لیے رجالِ کار ہمارے

زیراثر اداروں میں کس حد تک پیدا ہورہے ہیں؟ اس کا جواب مشکل بھی ہے اور شاید نامطلوب بھی کیونکہ اس سے ''ناراضی اور مایوسی'' پھیلنے کا خدشہ ہے۔

۴۔ سرکاری نظامِ تعلیم اور اس کے انتظام وانصرام کے متعلق ماہرین کی رائے یہ ہے کہ اسے سول بیوروکریسی کی طرز پر استوار کیا گیا ہے جو اس کے سطحی پن اور ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ ہماری ناقص رائے میں شاید ہم بھی کچھ اسی طرز کی فروگزاشت کا شکار ہیں۔

۵۔ سرکاری تعلیمی اداروں خصوصاً کالجز اور یونیورسٹیوں میں محبانِ اسلام اور محبانِ پاکستان کا وجود قابلِ ذکر سے بڑھ کر قابلِ قدر تعداد میں ہوتا تھا۔ان اداروں سے اس گروہ کی پسپائی ہوئی ہے۔اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ مخالف مضبوط ہو گئے ہیں یا حکومتی اقدامات مخالف پڑے ہیں۔اس میں شاید اس مخلص گروہ کی اپنی کوتاہیاں زیادہ قابل غور ہیں۔اساتذہ میں مثبت رویوں کا نفوذ بھی روبہ زوال ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ دعوت میں کشش نہیں رہی بلکہ کثیرالجہتی عوامل ہیں جن پر سوچ بچار ہونی چاہیے۔

پس چہ باید کرد؟

حکومت سے توقع عبث ہے کیونکہ وہاں نہ تو کوئی منصوبہ ہے نہ فیصلہ سازی کی قوت۔اگر جیسی کیسی فیصلہ سازی ہو بھی تو قوتِ نافذہ مفقود ہے۔ایسی صورت میں محب وطن اور محب اسلام قوتوں کو آگے آنا چاہیے۔سارے کام چھوڑ کر تعلیم کو ترجیح اول بنانا چاہیے۔فری فار آل کے ماحول میں کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ جہاں دوسروں کو من مانی کی آزادی ہے وہاں ہمیں بھی شاید روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اگر ہم حق پر مبنی موثر تعلیمی ماڈل تیار کریں، اُسے روبہ عمل لائیں اور آؤٹ پٹ (Output) کی بنا پر قبولیت حاصل کریں تو مسئلے کا حل نکلے گا۔محض مطالبوں، قراردادوں اور ریلیوں سے تعلیم کا مسئلہ اب حل ہونے والا نہیں۔ کچھ کر کے دکھانے سے ہی راستہ بنے گا اگرچہ کام کٹھن اور طویل ہے۔کیا ہم معاشرے میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے یہ چیلنج قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟

البرہان

پروفیسر ملک صاحب کے اس تجزیے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کتنا ہمارے ہاتھوں میں ہے اور کتنا اغیار کے ہاتھوں میں اور ان لوگوں کو تو چھوڑ یئے جو مغرب سے مرعوب ومتاثر ہیں اور اس کی پیروی کو دنیاوی کامیابی کی کنجی سمجھتے ہیں، یہ دیکھیے کہ وہ لوگ جو اسلامی نظام تعلیم کے علمبردار ہیں وہ کس خضوع و خشوع سے اغیار کے تصورات اور مقاصد کی برآری کے لیے'اسلامی جدوجہد' کررہے ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد شریف نظامی ☆

پنجاب میں تعلیم کو غیر اسلامی بنانے کی کاوشیں

ایک بار بابائے اردو مولوی عبدالحق (مرحوم) نے فرمایا تھا:

''زبان کسی قوم کی جان ہوتی ہے اس کا گلا گھوٹنا گویا قوم کا گلا دبانا ہوتا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ایک دفعہ آئرلینڈ کے ایک پادری نے جو ایک کالج کے پرنسپل بھی تھے، بابائے اردو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''اپنی زبان کی بہت تندہی سے حفاظت کرنا کیونکہ فاتح قوم سب سے پہلے مفتوح قوم کی زبان کو مٹاتی ہے ہمیں اس امر کا تجربہ اپنے ملک میں ہو چکا ہے کہ ہمارے ساتھ ایسے ہی کیا گیا تھا''۔

درجِ بالا دو اقوال کو پیش نظر رکھیں تو وطنِ عزیز میں قومی زبان اردو کے حوالے سے ایک بھیانک تصویر سامنے آتی ہے۔ مسلم لیگ (ن) کی حکومت میں جو قائداعظم کی مسلم لیگ کی اصل وارث ہونے کی دعویدار ہے، کے دور حکومت میں مائیکل باربر نامی ''ایجوکیشن ایڈوائزر'' دوسرا لارڈ میکالے بن کر نظام تعلیم پر مشقِ ستم جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس تناظر میں ایک بار پھر لارڈ میکالے کے تاریخی بیان کو ذہنوں میں تازہ کر لیجیے۔ اس نے ۱۸۳۵ء میں جب مسلمانوں کی نسلوں کے نظریاتی اغواء کا منصوبہ بنایا تو ان الفاظ کے ساتھ اپنے مدعا کا اظہار کیا تھا: ''ہم ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوگا مگر مزاج، طبیعت، رائے، اخلاق، عادات اور فہم و فراست کے لحاظ سے انگریزی'' اس کے ساتھ ہی اس کے بہنوئی چارلس ٹریولین کی بات بھی نہایت قابل غور ہے۔ وہ کہتا ہے: ''اگر مسلمان قدیم علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہے تو وہ ہم سے خوش نہیں رہ سکتے، وہ دوبارہ بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہمیں غاصب کی بجائے اپنا دوست سمجھے گا۔ یہ لوگ ہندوستانی کم اور انگریز زیادہ ہوں گے۔ وہ ہم سے نفرت کرنے کی بجائے ہمیں اپنا محسن سمجھیں گے اور ہماری مشابہت کو اپنی معراج تصور کریں گے۔ گو ''محمڈن ازم'' (اسلام) سخت مادے کا بنا ہوا ہے تاہم وہ نوجوان جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی ہوگی شریعت کی تعلیم حاصل کرنے والے سے بالکل مختلف بن جائے گا۔''

علامہ اقبال نے مندرجہ بالا دشمنانِ ملت کے عزائم کی تکمیل کے حوالے سے بعد میں یوں نشاندہی فرمائی تھی:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

☆ صدر پاکستان قومی زبان تحریک، لاہور

مائیکل باربر کے پیروکار جناب خادمِ اعلیٰ پنجاب کا یہ بیان اخبارات میں بڑی وضاحت کے ساتھ چھپ چکا ہے کہ ہم آپ کے دیئے ہوئے روڈ میپ کے عین مطابق دن رات تعلیمی اصلاحات پر عمل درآمد میں مصروف ہیں۔ ان کی ملت کش اصلاحات کے تحت جو اقدامات بروئے کار لائے جا رہے ہیں ان کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ صوبہ پنجاب کے تمام سرکاری سکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کر کے انگلش میڈیم نافذ کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ فی الحال کیا یہ گیا ہے کہ سائنس، ریاضی اور کمپیوٹر کے مضامین انگریزی میں پڑھائے جائیں گے لیکن ہر سکول کی پیشانی پر انگلش میڈیم کے بورڈ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کل کلاں ایک اور نوٹیفکیشن جاری کر دیا جائے گا کہ اب اسلامیات بھی انگریزی میں پڑھائی جائے گی۔

۲۔ سکولوں کے باہر قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کے تراجم، بزرگوں کے اقوال اور علامہ اقبال کے اشعار کی جگہ انگریزی عبارات نمایاں طور پر لکھنے کے احکامات صادر ہو چکے ہیں۔

۳۔ عقل یہ حکم سن کر سر پیٹ کر رہ جاتی ہے کہ پرائمری سکولوں تک کی اسمبلی میں اگر کوئی قرآنی آیت پڑھی جائے تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی بچوں کو سنایا جائے۔

۴۔ تین دن اسمبلی میں اردو میں اور تین دن انگریزی میں تقاریر ہوں گی۔ دوران کلاس بچوں کے ساتھ انگریزی میں گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے۔

۵۔ نویں جماعت کی انگریزی کی سابقہ کتاب کا پہلا سبق 'حضرت محمد ﷺ۔ بطور عظیم مصلح' تھا۔ اس کو خارج کر کے نئی کتاب میں آغاز میں ڈینگی مچھر پر طویل سبق شامل کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ پر سبق ڈیڑھ صفحے کا تھا اور ڈینگی مچھر کی خدمت میں سات صفحات پیش کیے گئے ہیں۔

۶۔ پنجاب کے سکولوں میں تعلیم مخلوط کر دی گئی ہے اور آئندہ لڑکیوں اور لڑکوں کے سکولوں کے انضمام کی غرض سے مفاہمتی معاہدے پر دستخط کیے جا چکے ہیں۔ گویا ترقی بذریعہ اختلاط طلبا و طالبات کے نسخہ پر عملدرآمد کا پروگرام ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ قوم مندرجہ بالا اقدامات کے سامنے کس قدر مزاحمت کرتی ہے اور غیرت کا ثبوت دیتی ہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ پورے صوبہ پنجاب کے ضلعی افسران تعلیم جن میں خواتین بھی شامل تھیں، سے خطاب فرماتے ہوئے لارڈ میکالے ثانی یعنی مائیکل باربر صاحب نے کہا کہ جو میرے روڈ میپ پر عمل کرنے میں رکاوٹ بنے گا اسے الٹا لٹکا دوں گا۔

کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اب لمحہ فکریہ یہ ہے کہ جہانِ غرور کی اونچی چوٹیوں پر کھڑے دینی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اوراسلامی فکر وفہم کے دعویدار اخبارات کے ایڈیٹروں اور کالم نگاروں کو یہ سب کچھ نہ جانے کیوں نظر نہیں آرہا؟ معلوم نہیں وہ اس سے بے خبر ہیں یا یہ تمام اموران کے نزدیک غیر اہم ہیں۔ کاش! وہ ان چوٹیوں سے قومی غیرت کے نکلتے ہوئے جنازوں کی غاروں میں جھانکیں اوراپنا کردارادا کریں۔

لارڈ میکالے ثانی کے انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بخوبی جان چکے ہیں کہ لارڈ میکالے اول نے جوخواب دیکھا تھا اس کی مزید عملی تعبیر کے لیے اب بہترین موقع ہاتھ آیا ہے۔ بعض باخبر حضرات کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت دو چار ماہ کی مہمان ہے، آپ بلاوجہ فکرمند نہ ہوں لیکن شاید انہیں معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں سیاسی چہرے بدل جانے سے پالیسیاں نہیں بدلتیں۔ کہنے کوتو ان حکومتوں میں اینٹ کتے کا بیر ہے لیکن جو کچھ پرویز الٰہی صاحب نے تعلیمی پروگرام کے حوالے سے طے کیا تھا خادم اعلیٰ صاحب بھی اسی کو آگے بڑھانے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں کیونکہ دونوں ایک ہی آقا کے پختہ کار غلام ہیں۔ کاش! دن رات علامہ اقبال کے نام کی منافقانہ مالا جپنے والے ان کی اس بات پر بھی غور کرتے کہ:

تیری آبرو اسی سے، تیری زندگی اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

شاید چندڈالروں کے عوض انہوں نے روسیاہی کا فیصلہ کرلیا ہے۔

البرہان

پنجاب حکومت کے برطانوی ایڈوائزراوران کے لوکل حمایتی کالے انگریزوں نے ٹھیک پہچانا ہے کہ مسلمانوں کوان کی خودی سے محروم کرنے کے تین طریقے ہیں:

۱۔ اردو سے محروم کرکے اس قوم کواس کی زبان'کلچراوردین سے کاٹ دو۔

۲۔ انگریزی کے غلبے سے انہیں مغرب کا ذہنی غلام بنادواورشرح تعلیم نہ بڑھنے دو۔

۳۔ مخلوط تعلیم سے ان کے اخلاق تباہ کردو،عریانی وفحاشی پھیلاؤاورحیاوعفت کا خاتمہ کردو۔

پنجاب کے بےعقل حکمرانوں کوشاید اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ کیا کررہے ہیں؟

تعلیم و تربیت

عبدالرشید ارشد

تعلیمی ادارے یا کاروباری سپر سٹور

بڑے شہر ہوں یا چھوٹے بلکہ دیہات تک کے گلی محلوں میں لگے خوبصورت بورڈ اور بینرز دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ آج کا نفع بخش بزنس اگر کوئی ہے تو وہ تعلیمی ادارے کھولنا ہے۔ اس کاروبار میں نفع کی شرح تو کم یا زیادہ ہوسکتی ہے مگر خسارہ دُور دُور تک نہیں ہے۔ کاروبار جنرل اَور سپر سٹوروں کے بینرز کی طرح تعلیمی اداروں کے انتہائی دیدہ زیب بورڈ اور بینرز دلکش مراعات کی نوید مسرت سناتے ہیں۔ مثلاً ایک سٹور کا بینر آج بھی ہمارے سامنے ہے جس میں خوشخبری ہے کہ فلاں تاریخ تک ۷۱٪ فی صد کمی یعنی صرف ۲۹ فی صد پر 'خریداری' کیجیے۔ اس 'سنہری' موقعے سے کون فائدہ نہ اٹھانا چاہے گا۔

کریانہ اور جنرل سٹوروں کی پُرکشش مراعات ہی کی طرح ہمارے سامنے تعلیمی اداروں کے دید زیب چمکتے بورڈ چیخ چیخ کر یہ اعلان کررہے ہیں کہ داخلہ لینے والے پہلے طالب علم کو فلاں انعام دیا جائے گا، فلاں نئی موٹر سائیکل کا حق دار ہوگا تو فلاں کو نئے ماڈل کی کار کی چابی پیش کی جائے گی۔ یہ 'کاروباری مقابلہ' مختلف 'گروپ آف کالجز'، 'چین آف کالجز' اور 'سکول سسٹم' وغیرہ کے مابین ہے۔ یہ انگلش میڈیم بھی ہیں اور اُردو میڈیم بھی ہیں بلکہ اکثر میں ملا جلا میڈیم پنجابی 'تڑکے' کے ساتھ بھی علم کی خدمت میں مصروف ہے۔

پہلے ادوار میں بچوں کے والدین کو ابتداء میں فیس داخلہ کے چند روپے اور پھر معمولی ماہوار فیس ادا کرنا ہوتی تھی، بچے ٹاٹ یا ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ آج داخلہ فیس اور ماہوار فیس کی جگہ 'پیکج' نے لے لی ہے اور اس پیکج کا وزن یونیورسٹی، کالج، سکول کی 'عظمت و اہمیت' کے حوالے سے الگ الگ ہے۔ یہ وزن ہزاروں مالیت کا بھی ہوسکتا ہے اور لاکھوں مالیت کا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں عملاً ایسے ادارے موجود ہیں جن کی نقل اتارتے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبات میں بھی اس 'نسخے' پر عمل ہو رہا ہے۔ سرکاری سکول ان حالات میں یتیم خانے محسوس ہوتے ہیں کہ نہ وہ یونی فارم، نہ ویسے سکول بیگ، نہ ویسی چال ڈھال اَور بول چال کا انداز۔

پہلے دو طرح کے تعلیمی ادارے ہوتے تھے یعنی دینی مدارس اور سکول کالج وغیرہ۔ آج دینی مدارس، سرکاری سکول کالج اور نجی سکول کالج بن گئے۔ سرکاری سکول کالج میں طلباء و طالبات کو انگریزی بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے جب کہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا نظام انگلش میڈیم ہے۔ سرکاری تعلیمی

اداروں کے طلباء طالبات تکمیل تعلیم کے بعد اس مقام سے محروم رہتے ہیں جو انگلش میڈیم والوں کا مقدر بنتا ہے۔ علمی سطح پر اگر سرکاری سکولوں کے بچے ذہین بھی ہوں تو بورڈ یونیورسٹی میں نمبر زیادہ پرائیویٹ، 'انگلش میڈیم مارکہ' اداروں کے طلبا و طالبات کے ہی ہوتے ہیں۔ بعض باخبروں کا کہنا ہے کہ نام کی لاج رکھنے کی خاطر یا آئندہ اچھے داخلہ کے لیے 'اپروچ' ان کے لیے ناگزیر ہے۔

وطنِ عزیز کی بنیاد، بقول بانی پاکستان، اسلام کا نظریۂ حیات تھی، جسے قائم رکھنے کے لیے ہر دَور کی حکومت کے ذمہ داران حلف اُٹھاتے رہے ہیں اور اُسی نظریئے پر دستورِ پاکستان تشکیل پایا تھا مگر عمل کے نکتہ نظر سے ہم وفاتِ قائد کے بعد لمحہ لمحہ اور قدم قدم انحراف کے مرتکب ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے یہ انحراف کسی ایک شعبہ زندگی میں نہیں بلکہ اس کے مظاہر چہار سو دیکھنے میں آتے ہیں اور تعلیم سرفہرست ہے۔

نظریاتی تعلیم سے انحراف اور روشن خیالی سے بھرپور نظامِ تعلیم، ممکن ہے ملک وقوم کو امریکہ و یورپ بنادے مگر یہ ملک وقوم کی فلاح کی ضمانت دینے سے معذور ہی رہے گا۔ امریکہ و یورپ کی ترقی تو سب کو نظر آتی ہے مگر سماج و معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ، بے اطمینانی اور احساسِ عدم استحکام بہت کم روشن خیالوں کو نظر آتا ہے حالانکہ یہی عناصر استحکامِ ملک وقوم کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

نظامِ ہستی میں بنیادی کردار علم کا نہ ہوتا تو خالق کائنات تخلیق آدم کے وقت علم کو کسوٹی نہ بناتے۔ اس علم کا منبع خود خالق تھا۔ وعلم ادم الاسماء کلھا۔ گویا انسانی معاشرہ میں مرکزی کردار علم کا ہے اور بقیہ ہر چیز اس کے گرد گھومتی ہے۔ کسی بھی ملک یا سماج و معاشرہ کے استحکام میں جن عوامل کو ترجیحاً اہم ترین سمجھا یا کہا جاتا ہے ان میں سرفہرست معیشت کہی جاتی ہے اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ 'غریب کا ایمان متزلزل رہتا ہے' یا بقول پنجابی ضرب المثل ''ٹِڈھ نہ پیّاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں''، یعنی اگر پیٹ روٹی سے خالی ہے تو چاروں طرف اندھیر ہے۔ معیشت انفرادی سطح پر کمزور ہو یا قومی اور ملکی سطح پہ، اخلاق و کردار کی اعلیٰ اقدار کو ڈستی رہتی ہے۔ ایسے میں اگر علم کا حقیقی سرمایہ مقدر ہو تو اقدار تباہ ہونے سے بچ جاتی ہیں۔

عملی زندگی میں کامیابی، خواہ کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کا راز نظریاتی تعلیم کے معیاری ہونے پر ہے۔ یہ معیشت ہو یا، یہ اس کا شعبہ زراعت ہو یا صنعت ہو۔ حتیٰ کہ اخلاق و کردار بھی تعلیم کا مرہون منت ہے۔ نظریاتی تعلیم کو نظر انداز کر کے اگر معاشی ترقی حاصل کر بھی لی جائے تو اس میں استمرار و استحکام کی ضمانت کسی کے پاس نہیں۔ یہ عارضی ثابت ہوتی ہے۔ امریکہ و روسی معیشت کا دم توڑنا آج سب کے سامنے ہے۔

امریکہ و یورپ ظاہری چمک دمک سے ہٹ کر اندر سے کھوکھلے ہو رہے ہیں اور اب دُم کٹی لومڑی کے نقش قدم پر چلتے مسلم ممالک، بالخصوص نظریاتی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی نظامِ تعلیم اور نظامِ معیشت

اخلاق کی دم کاٹنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ زمانے کے بدلتے تقاضوں سے تعلیم کو ہم آہنگ رکھنا قومی وملکی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ امریکہ ویورپ کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہمیں روشن خیال تعلیم ہی ترقی کی راہ پر گامزن رکھ سکتی ہے اور روشن خیالی کا بنیاد پرستی سے تعلق نہیں ہے۔

روشن خیال تعلیم کے لیے 'انتہائی روشن خیال' تعلیمی ادارے معرضِ وجود میں آ رہے ہیں، جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ایم بی اے، فنانس ایکسپرٹ، صنعت کار، سائنس دان اور انجینئر وغیرہ تیار ہوتے ہیں جو ہر طرح مغربی معیار پر تو پورے اترتے ہیں مگر امرِ واقع یہ ہے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ کا کردار ادا کرنے کے اہل ثابت نہیں ہوتے کہ سودی معیشت کی آبیاری تو کرتے ہیں اسلام کے نظامِ معیشت کی انہیں خبر نہیں ہوتی۔ 'ماہرین تعلیم' تو بنتے ہیں، اسلامی اخلاق و کردار اور اقدار کی ضرورت سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ ہر چیز کو مالی مفاد کے پلڑے میں ڈال کر وزن کیا جاتا ہے۔ عملی زندگی میں یہ روشن خیال فارغ التحصیل جہاں فٹ ہوتے ہیں وہاں سب سے پہلی ترجیح مہنگی تعلیم پر اُٹھنے والے اخراجات کی 'فراہمی' ہوتی ہے جس کے مظاہر عوام ڈاکٹروں، انجینئروں وغیرہ کے دورانِ ملازمت رویوں میں دیکھتے ہی نہیں عملاً انجوائے بھی کرتے ہیں کہ کرپشن چارسو ناچتی ہے۔

دہشت گرد کون؟

ایک جرمن مسلم سکالر کا وہ جواب مجھے بہت پسند ہے جو اس نے ان لوگوں کو دیا جو اس سے اسلام اور دہشت گردی کے موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اس نے کہا:

☆ پہلی جنگ عظیم کس نے چھیڑی تھی؟ کیا مسلمانوں نے؟

☆ دوسری جنگ عظیم کس نے چھیڑی تھی؟ کیا مسلمانوں نے؟

☆ آسٹریلیا میں دو کروڑ مقامی ابورجنوں کو کس نے قتل کیا تھا؟ کیا مسلمانوں نے؟

☆ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کس نے پھینکا تھا؟ کیا مسلمانوں نے؟

☆ شمالی امریکا میں ۱۰ کروڑ مقامی انڈینز کو کس نے مارا تھا؟ کیا مسلمانوں نے؟

☆ جنوبی امریکہ میں ۵ کروڑ انڈینز کو کس نے قتل کیا تھا؟ کیا مسلمانوں نے؟

☆ افریقہ سے ۱۸ کروڑ حبشیوں کو غلام بنا کر کون لایا تھا جن میں سے ۸۸ فیصد راستے میں مر گئے اور سمندر برد کر دیئے گئے؟ کیا مسلمان؟

نہیں! ان میں سے کوئی بھی کارنامہ انجام دینے والے مسلمان نہیں تھے۔ تو پھر پہلے یہ طے کرو کہ دہشت گردی ہوتی کیا ہے؟ اگر کوئی غیر مسلم بری حرکت کرے تو وہ معمولی جرم سمجھا

جاتا ہے اور وہی کام اگر کوئی مسلمان کرے تو وہ دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے، تو پہلے یہ دوہرے معیار ختم کرو، پھر ہی اس موضوع پر کوئی فیصلہ کن بات ہوسکتی ہے۔

(زاہد اقبال، راولپنڈی)

پاکستانیات ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کا مستقبل ۔ سیکولر یا اسلامی؟

بسلسلہ عمران خاں کا کردار

عمران خان کے 'سونامی' کی لہریں جب ہم تک بھی پہنچیں تو ہم نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس کے ہاتھوں پاکستان میں کسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں کرتے کہ اس کے فکر و کردار پر بھی مغربی تہذیب کی چھاپ ہے اور جس طرح امریکیوں اور اسٹیبلشمنٹ سے اس کے روابط سامنے آئے ہیں اور جس طرح کے لوگ اس کی پارٹی میں آئے اور آرہے ہیں اس کے بعد اگر وہ اپنے حریفوں سے بہتر ہوا بھی تو انیس بیس کا فرق ہوگا یا زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس کا، انقلاب کی توقع اس سے عبث ہے۔ ظاہر ہے ہمارا یہ تجزیہ ان لوگوں کو پسند نہیں آیا جو اس کے حمایتی ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔ مجیب الرحمن شامی صاحب نے عمران کی کتاب 'میں اور میرا پاکستان' ہمیں دیتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھنے کے بعد امید ہے آپ کی رائے بدل جائے گی ___ ہاں! آگے بڑھنے سے پہلے ایک ضمنی بات - یہ کتاب واقعی بہت اچھی ہے۔ ہم نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے اور ہم قارئین کو اس کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں، خواہ انہیں عمران خان سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۱۔ عمران خاں کے دوسرے بہت سے مداحوں کی طرح ماہنامہ چشم بیدار لاہور کے ایڈیٹر اور ہمارے دوست ملک احمد سرور صاحب کی بھی رائے یہ ہے کہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہوچکی ہیں۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کو لوگ کئی بار آزما چکے ہیں لہٰذا عمران خاں اگر تیسرے بہتر متبادل کے طور پر ہمارے سامنے آرہے ہیں تو ان کی حمایت کی جانی چاہیے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس موقف میں وزن ہے۔ دینی سیاسی جماعتیں واقعی ڈیلیور نہیں کرسکیں اور نہ اس وقت تک ان میں سے کوئی انفرادی طور پر اور نہ مل کر دو بڑی سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں وہ تیسرے متبادل کے طور پر سامنے آسکی ہیں۔ پیپلز پارٹی (اور اس کے اتحادی) دین و دنیا کا خسارہ ہیں اور مسلم لیگ ن کوئی بڑی تبدیلی نہ لاسکے گی اور ان دونوں کو کئی بار آزمایا بھی جاچکا ہے لہٰذا عمران خاں کو تیسرے اور بہتر متبادل کے لیے زیر غور لایا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر زمینی سیاسی حقائق ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہو تو دیگر امکانات بھی ہیں جنہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ عمران خاں تبدیلی لانے کی پوزیشن میں صرف اس وقت ہوں گے جب وہ تبدیلی

کے لیے ایک پر زور اور کامیاب تحریک چلا سکیں اور اقتدار میں آ جائیں ورنہ اگر وہ محض تیسری قوت کے طور پر اُبھرے اور ۲۰۔۳۰ یا ۷۰۔۸۰ نشستیں جیت سکے تو وہ محض ن لیگ کی نشستیں کم کریں گے اور منقسم (ہنگ) پارلیمنٹ وجود میں آئے گی اور پی پی اپنی تمام تر منحوسیت سمیت (دوسرے چھوٹے گروپوں کو ساتھ ملا کر) دوبارہ برسر اقتدار آ جائے گی، غیر ملکی ہاتھوں میں کھیلتی رہے گی اور لوگ یہ سوچنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھیں گے کہ عمران خاں شاید غیر ملکی اور پاکستانی ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ اور یہ امکان بھی ہے کہ عمران خاں تحریک چلا کر کامیاب تو ہو جائیں لیکن بھٹو کی طرح ناکارہ ساتھیوں، غیر اسلامی پالیسیوں اور اندرونی و بیرونی دباؤ کی وجہ سے کوئی بڑی تبدیلی نہ لا سکیں۔

۲۔ لیکن معاف کیجیے گا مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے اور یہ محض عمران خاں کو ووٹ دینے یا نہ دینے کی بات بھی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر عمران خاں جیت بھی جائیں اور کرپشن کے خاتمے اور گڈ گورننس کے لیے کچھ اقدامات کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو پھر؟ آگے کیا؟ کیا مجیب الرحمن شامی صاحب اور ملک احمد سرور صاحب کے آئیڈیلز اتنے ہی تھے اور ہیں کہ پاکستان میں ایک صاف ستھری حکومت بن جائے اور بس! ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ دو امور پر غور فرمائیں:

ایک یہ کہ کیا پولیٹیکل سائنس اور مینجمنٹ سائنس غیر اقداری (Value Neutal) ہوتے ہیں؟ مغرب کے پس مابعد جدیدیت مفکرین جیسے پاپر، کوہن اور ہائیڈیگر وغیرہ تو اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ غیر اقداری نہیں ہے (ہم اس پر البرہان میں مسلسل مضامین شائع کر رہے ہیں) اور وہ اخلاق اور مذہب کی نقیض ہے اور آپ کس سادگی سے پولیٹیکل سائنس جیسی سوشل سائنس کو غیر اقداری سمجھ رہے ہیں جس کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کا مغرب کے الحادی ورلڈ ویو کی پیداوار ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے لہٰذا سیاسی اور انتظامی سطح پر بہتری کے لیے جو اور جتنے بھی اقدامات کیے جائیں وہ لازماً نظریاتی اساس رکھتے ہیں اور یہ اساسات دو ہی ہو سکتی ہیں یا تو یہ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب پر مبنی ہوں گے جو اس وقت دنیا پر غالب ہے اور یا اسلامی اصولوں پر جو اس وقت دنیا میں غالب اور نافذ تو کہیں نہیں لیکن دنیا کے پونے دو ارب مسلمان ان پر ایمان رکھنے کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں۔

دوسرے بحیثیت مسلمان ہمارے آئیڈیلز کیا ہیں؟ یہ کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لے۔ وہ راضی کیسے ہوگا؟ اس طرح کہ ہم اپنی زندگی اس کے احکام کے مطابق گزاریں، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ یعنی ہم میں سے ہر فرد اپنی ذاتی زندگی میں بھی اللہ و رسول کی تعلیمات پر عمل کرے اور معاشرے و ریاست کی سطح پر بھی اسلامی اصولوں پر عمل ہو اور اس سیکولرزم کا اسلام میں کوئی تصور نہیں کہ دین صرف نماز روزے کا نام ہے اور سیاسی و اجتماعی زندگی اور اس کے اداروں کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر ہم دین کے اس تصور کو مانتے ہیں اور ہمارے علم کی حد تک یہ دین کا متفقہ اور مجمع علیہ تصور ہے اور پچھلے چودہ سو سال سے امت کے اہل علم اسی کو مانتے آ رہے ہیں۔ ہمارے اہل علم میں اختلاف اس امر میں تو ہوا ہے کہ بعض جدید اور فروعی مسائل میں شریعت کا حکم یا منشا کیا ہے؟ یا بعض لوگوں نے شریعت کے احکام پر عمل کرنے میں غفلت برتی ہے لیکن یہ کبھی کسی نے نہیں کہا کہ شریعت کو ہمارے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں یا اسلامی اصول قابل عمل نہیں اور کبھی کسی کو علی الاعلان یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی کہ ہم احکام شریعت پر عمل نہیں کریں گے ــــ اور کبھی کوئی استثنائی معاملہ ایسا ہوا بھی ہے تو امت نے اس کی نقیض کی ہے اور اسے قبول نہیں کیا ہے۔

۳۔سوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ تسلیم کر لیں کہ پاکستان میں اب سیاست سیکولر ہوا کرے گی؟ زرداری صاحب نے یہ کہہ کر کہ سیاسی معاہدے قرآن وسنت کا حرف نہیں ہوتے اس کی مثال قائم کر دی ہے اور عمران خاں نے اپنے جلسوں میں کنسرٹ کو رواج دے کر اور گانے ناچنے والے ابرارالحق کو اپنی جماعت میں مرکزی عہدہ دے کر اور پنجاب اسمبلی میں فحاشی وعریانی اور رقص وسرود کو پرموٹ کرنے والے مغرب سے مرعوب ومتاثر ٹی وی چینلز کے شوروغوغا سے متاثر ہو کر کنسرٹ کے حق میں پاس ہونے والی قرارداد کی حمایت کر کے کیا تاثر دیا ہے؟ اور اس نے یہ بھی کبھی نہیں کہا کہ وہ ریاست کو اسلام کے آئیڈیلز کے مطابق چلائے گا؟ یا ریاست کے اسلامی اہداف حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ دیکھیے! علماء اور مذہبی سیاسی جماعتوں سے فاصلہ رکھنا ایک بات ہے اور اسلام اور اسلام کی سیاسی، تعلیمی، معاشی، قانونی ــــ تعلیمات واحکام سے فاصلہ رکھنا دوسری بات ہے۔ پہلی بات کے لیے آپ عذر تراش سکتے ہیں اور وہ قابل قبول بھی ہو سکتے ہیں لیکن دوسرے رویے کے لیے آپ کیا جواز تراشیں گے؟

۴۔دیکھیے جناب! ریاست کے مغربی تصور اور اسلامی تصور میں فرق بہت واضح ہے۔ مغرب میں ریاست سیکولر ہے اور اس کے کوئی دینی یا روحانی اہداف نہیں ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف دنیا ہے (آخرت کے تصور کے بغیر) اور دنیا کی زندگی کی کامیابی ہے (وحی کی رہنمائی کو ردّ کرتے ہوئے) جب کہ اسلام میں ریاست کے بنیادی مقاصد یہ ہیں کہ اسلام کے جن احکام پر عمل کے لیے اجتماعی قوت (اقتدار) درکار ہے ریاست وہ سارے کام کرے یعنی قیام نظام صلاۃ وزکوٰۃ، جہاد، حدود اور اسلام کے سیاسی، معاشی اور سماجی پہلوؤں کا نفاذ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی فرد کی مساعدت اور اس کے لیے ایسا ماحول پیدا کرنا کہ الٰہی احکام پر عمل اس کے لیے سہل ہو جائے اور کم وبیش یہ ساری باتیں پاکستان کے آئین میں موجود ہیں (اور ان مذہبی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کی وجہ سے ہیں جنہیں بُرا کہتے ہماری زبان نہیں تھکتی) مثلاً یہ کہ ریاست اسلامی جمہوری ہوگی (۱) اور اس کا مذہب اسلام ہوگا (۲)۔ جب

ریاست کا نام بھی اسلامی ہے اور مذہب بھی اسلامی ہے تو وہ ساری ذمہ داریاں اور سارے کام جو اسلام میں مطلوب ہیں وہ اسے کرنے چاہئیں چنانچہ آگے چل کر آئین میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ریاست پاکستان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں مدد دے اور ایسے حالات

۱۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان، آئین ۱۹۷۳ء، دفعہ ۱	۲۔ آئین دفعہ ۲

پیدا کرے کہ وہ اسلامی زندگی گزار سکیں (۱)۔ خصوصاً اس کے لیے وہ نظام تعلیم کو اسلامی بنائے اور انہیں قرآن اور اسلامی علوم کی تعلیم دے اور عربی زبان کی تدریس کا اہتمام کرے (۲)۔ آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں اقتدار کے اہل صرف وہ لوگ ہوں گے جو نیک، متقی اور ایماندار ہوں گے (۳)۔ اور ریاست کو ان امور پر عمل میں مدد دینے کے لیے اسلامی علوم کے ماہرین پر مشتمل ایک ادارہ (اسلامی نظریاتی کونسل) بھی ہے (۴)۔ کوئی قانون خلاف قرآن وسنت نہیں بنایا جاسکتا (۵)۔ اور ایک وفاقی شرعی عدالت تشکیل دی گئی ہے جو غیر اسلامی قوانین کو ختم کر سکتی ہے (۶)۔

لیکن ہمارے ہاں کوئی سیاسی جماعت آئین کی ان دفعات پر عمل نہیں کرتی۔ نہ عمران خاں نے کبھی کہا ہے کہ وہ سنجیدگی سے ریاست کے اسلامی کردار کو موثر طور پر روبہ عمل لائے گا۔ نہ اس میں ذاتی طور پر اس کام کی اہلیت اور جذبے کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ اس کی جماعت میں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن کا پس منظر و پیش منظر ریاست کے اسلامی کردار کا موید نظر آتا ہو۔

۵۔ ہمارے نزدیک آج جس عہد میں ہم زندہ ہیں، اس میں اسلام پر عمل ممکن ہی نہیں جب تک آپ شعوری طور پر مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کو ردّ نہ کریں کیونکہ مغربی تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اسلام کی تہذیب غالب نہیں ہے بلکہ ہمیں اسے غالب کرنا ہے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہر مسلمان فرد اپنی ذاتی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرے اور مسلمان ریاست اجتماعی زندگی میں اسلامی احکام پر عمل کرے اور فرد کی بھی اس کار خیر میں معاونت کرے جس کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیم، میڈیا اور ذہن سازی کے دوسرے ذرائع ہیں۔ معاف کیجیے گا ہمیں عمران خاں اور اس کی جماعت میں فی الحال یہ اہلیت اور جذبہ نہیں آتا کہ وہ مغربی وفکر وتہذیب کو ردّ کرتے ہوئے اسلامی فکر وعمل کو حرزِ جاں بنائے البتہ ہماری دعا اور خواہش ضرور ہے کہ کاش وہ ایسا کریں اور کر سکیں۔ یہ دعا اور خواہش نہ صرف عمران خاں کے لیے ہے بلکہ ہر مسلمان حکمران کے لیے ہے کیونکہ ہم پاکستان کو ایک سیکولر اور مغرب پرست معاشرہ اور ریاست کے طور پر نہیں دیکھ سکتے اور نہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

۶۔ عمران خاں نے اپنی جو سوانح لکھی ہے اس سے عیاں ہے کہ اس نے دین کو جتنا اور جن ذرائع سے سمجھا ہے (ذاتی اور خاندانی تجربات، بابے، ہارون رشید وغیرہ) اگرچہ وہ غنیمت ہے لیکن اس کا فہم دین بہر حال ابھی تک غیر متوازن اور ناقص ہے۔ سیاست کا گند صاف کرنا، کرپشن کا خاتمہ، میرٹ کی بحالی وغیرہ، بلاشبہ دین کی سیاسی اور انتظامی تعلیمات کا ایک حصہ ہیں لیکن یہ بہر حال پورا دین نہیں ہیں اور

نہ یہ اسدلام کی سیاسی تعلیمات کا مکمل مظہر ہیں بلکہ کیونکہ قرآن وسنت تو ریاست کے لیے قیام نظام صلاۃ و زکوٰۃ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اقامت حدود و جہاد بھی واجب ٹھہراتا ہے۔ اگرچہ اس کے برعکس بھی

۱۔ آئین دفعہ ۳۱(۱) ۲۔ آئین دفعہ ۳۱(۲) ۳۔ آئین دفعہ ۶۲، ۶۳

۴۔ آئین دفعہ ۲۲۸ ۵۔ آئین دفعہ ۲۲۷ ۶۔ آئین دفعہ ۲۰۳

ایسا ہی ہے یعنی اگر ہماری سیاسی جماعتیں دینی سیاست کونہیں اپنا رہیں تو ہماری دینی سیاسی جماعتیں اور مذہبی عناصر بھی عملاً دین کی جو تصویر پیش کر رہے ہیں وہ بھی یک رخی اور ناقص ہے کیونکہ عوام کے دنیاوی مسائل حل کرنا اور روٹی کپڑا مکان اور میرٹ کی فراہمی اور غربت و جہالت و کرپشن کا خاتمہ وغیرہ کا اسلام سے بڑھ کر علم بردار کون ہے؟

۷۔ ہم جیسے لوگ جو پاکستان میں فرد اور معاشرے وریاست کو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی دعائیں اور خواہشیں اپنی جگہ، زمینی حقائق بہرحال یہ ہیں کہ پاکستانی سیاست بڑی حد تک سیکولر ہو چکی ہے بلکہ سارے شعبہ ہائے حیات میں سیکولرزم اور مغرب پرستی کا زور ہے اور اسلام کا نام صرف کاغذوں اور لبوں پر ہے یا اس کے بعض پہلوؤں کا تھوڑا بہت اظہار ذاتی اور سماجی رسوم ورواج میں نظر آتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ہمارے فہم کے مطابق اس کے دو بڑے سبب ہیں: ایک تو یہ کہ مغربی تہذیب کی علمبردار طاقتور قومیں (امریکہ ویورپ) اپنی (اسلام مخالف) ساری قوت استعمال کر کے اپنی تہذیب ہمارے ہاں برآمد کر رہی ہیں اور اس کے لیے انہیں ہمارے سیاستدانوں، صحافیوں، دانشوروں...... میں سے ایسے افراد بآسانی مل جاتے ہیں جو حبّ مال وجاہ کے لیے ان کا کانٹا نگلنے کو بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے دینی عناصر موثر کارکردگی اور نتائج دکھانے میں ناکام رہے ہیں۔ جو دینی عناصر سیاست میں کام کر رہے ہیں نہ وہ متحد ہونے کے لیے تیار ہیں اور نہ فرد، معاشرے اور ریاست کے لیے قابل عمل اور موثر پالیسیاں سامنے لا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف وہ ماضی میں شکست کھاتے رہے ہیں بلکہ اب بھی اتنے منتشر اور کمزور ہیں کہ وہ قومی سیاسی زندگی میں تیسرے یا چوتھے متبادل کے طور پر بھی نظر نہیں آتے۔ ظاہر ہے اگر ان کا رویہ یہی رہا تو آئندہ بھی سیکولر اور مغرب پرست سیاسی قوتیں میدان ماریں گی اور شکست دین کی علم بردار جماعتوں کا مقدر بنے گی۔ اس کا حل یہی ہے کہ وہ متحد ہوں، متفقہ اسلامی ترجیحات اور عوامی مسائل کے حل کے لیے متفقہ تجاویز مل بیٹھ کر طے کریں اور چوتھے متبادل کے طور پر سامنے آئیں۔ کسی سیاسی گروپ (مثلاً عمران خان) سے افہام وتفہیم کے ذریعے اپنے کچھ اہم مطالبات (مثلاً امریکی غلامی سے نکلنا، تعلیم ومیڈیا کی اسلامی تشکیل، اسلام کے سماجی اصولوں کا نفاذ جیسے غربت وجہالت کا خاتمہ......وغیرہ) منوا کر اس سے اتحاد کر لیں تاکہ سیکولرازم اور مغرب پرستی کا سیلاب ہمارے فرد اور معاشرے کو بالکل ہی بہا نہ لے جائے۔ اور جو دینی عناصر سیاست میں حصہ نہیں لیتے وہ سماجی سطح پر متحرک ہو کر تعلیم وتربیت، میڈیا،

اصلاح اخلاق اور عوامی مسائل کے حل کے ذریعے معاشرے کو دینی و اخلاقی طور پر سنبھالنے کی کوشش کریں۔لیکن دینی سیاسی اور دینی غیر سیاسی قوتیں اگر متحد و منظم ہو کر صحیح رخ میں سرگرم عمل نہ ہوئیں تو پھر پاکستان کا مستقبل خدانخواستہ اسلامی نہیں سیکولر ہی ہوگا کیونکہ عمل کے بغیر محض دعاؤں اور خواہشوں سے کوئی قلعہ سر نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ **و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین**

ہمارا دینی تناظر میر افسر امان

بڑھتی ہوئی فرقہ واریت ۔ذمہ دار کون ہے؟

سنجیدہ لوگ ملک میں بڑھتی ہوئی مسلک پرستی اور دینی فرقہ واریت سے پہلے ہی نالاں تھے کہ اس انتشار میں مزید اضافے کی پریشان کن خبریں آ رہی ہیں۔ فرقہ وارانہ قتل و غارت کے نتیجے میں گلگت اور ہنزہ میں کئی ہفتوں سے کرفیو نافذ ہے اور یہی حال کوئٹہ کا ہے۔کراچی سے سنی تحریک نے پنجاب کا رخ کیا، مینار پاکستان میں جلسہ کیا، مسلم لیگ ن کے نواز شریف سے ملاقات کی اور انتخابات میں حصہ لینے کا عندیہ دیا۔کراچی ہی سے اہل تشیع کی مجلس وحدۃ المسلمین نے ایک بڑا جلسہ وہاں کیا اور اپنے حقوق کے لیے انتخابی عمل میں کودنے کا اعلان کیا۔ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ ان مسلکی گروپوں نے پہلے کون سے سیاسی معرکے سر کیے ہیں کہ اب انتخابات میں کامیابی کے جھنڈے گاڑیں گے؟ یہ سارے گروپ باہم مل جائیں تو بھی پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور تحریک انصاف کے مقابلے میں ان کا کوئی وزن نہیں بنتا چہ جائیکہ یہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسلکی گروپ بنا کر انتخاب میں حصہ لینے کا پروگرام بنالیں۔

ہم دینی مکاتب فکر میں اختلافات نکالا نہیں کرتے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ معاملہ اب داخلی سے زیادہ خارجی نظر آتا ہے۔اگرچہ اب حکومتی حلقے بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ فرقہ واریت کو ہوا دینے میں باہر کے ہاتھ ملوث ہیں لیکن وہ ان کا نام لینے اور ان کا مقابلہ کرنے سے اب بھی کتراتے ہیں۔ان حالات میں اس امر پر غور ضروری ہے کہ ان مسلک پرست گروپوں کے پیچھے اصل قوت کون سی ہے؟ اس کا جائزہ کراچی کے ایک صاحب نظر نے لیا ہے۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مدیر

راولپنڈی سے گلگت جانے والی چار بسوں کے سواروں کو کوہستان میں اتار کر شناخت کیا گیا اور بعد میں ۱۹ شہریوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا اور کئی کو زخمی کیا گیا۔حساس اداروں کی رپورٹ کے مطابق یہ واقعہ جنوری میں گلگت بلتستان میں ۸ افراد کے قتل کی وجہ سے ہوا۔کشیدگی اسی وقت سے تھی اگر

بروقت کارروائی کی جاتی تو سانحہ سے بچا جا سکتا تھا۔ممکن ہے یہی بات ہو،مگر اس سے ملتے جلتے واقعات اس سے پیشتر بلوچستان میں بھی ہو چکے ہیں،کیا وہاں بھی کوئی شیعہ سنی کشید گی تھی؟ ہمارے نزدیک کوئی مسلمان اس طرح کی قبیح حرکت نہیں کر سکتا۔آخر امریکہ کی پاکستان میں موجودہ مداخلت اور پاکستان کی اس جنگ میں شرکت سے پہلے طویل عرصے میں ایسی جسارت کبھی بھی کسی نے کی؟ ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کون یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ ملک میں نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری ہے۔یہ جنگ ہمارے پڑوسی ملک افغانستان سے امریکہ ہمارے ملک میں اپنے مقاصد کے لیے لے آیا ہے۔وجہ یہ ہے کہ وہاں امریکہ طالبان سے بُری طرح شکست کھا رہا ہے اور وہاں سے نکلنے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ہمارے ملک کے طول وعرض میں ایسے واقعات اور خودکش دھماکے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔افغان قوم کبھی بھی کسی غیر ملکی کی غلام نہیں رہی ہے۔روس کی شکست سے پہلے برطانیہ نے بھی بہت کوشش کی کہ افغانیوں کو زیر کرے مگر ایسا نہ ہوسکا۔آخری بار جب برطانیہ نے اپنی فوج افغانستان بھیجی تھی تو واپس صرف ایک فوجی آیا تھا۔اُسے بھی افعانیوں نے صرف اس لیے چھوڑا تھا کہ وہ اپنے کمانڈروں کو واپس جا کر حالات بتائے۔اتنی عبرت ناک شکست کے باوجود بھی اس سے سبق حاصل نہیں کیا گیا۔دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ لوگ تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے اور اپنی طاقت کو اندھا دھند غریب ملکوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔امریکہ نے جو کام عراق میں کیا وہی تجربہ اب پاکستان میں آزما رہا ہے۔وہاں شیعہ سُنی فسادات کرائے گئے تھے اور ایک دوسرے کے مقدس مقامات پر خودکش حملے کرائے گئے تا کہ لوگ دست و گریبان ہو جائیں اور امریکہ اپنے مقاصد حاصل کر لے۔

امریکہ کے لیے بلیک واٹر ایسے کام عراق میں کرتا رہا ہے اور اب ہمارے ملک میں یہ دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہے۔وہ اس طرح سُنی اور شیعہ اور دیوبندیوں اور بریلویوں کو باہم لڑانا چاہتا ہے مگر داد دینی چاہیے علما کرام کو کہ وہ اس سازش سے بخوبی آگاہ ہیں۔اس سے قبل بھی امام بارگاہوں،مساجد اور مزاروں پر خودکش حملے کروائے گئے تھے،مگر الحمدللہ کوئی بھی مذہبی گروہ آپس میں دست وگریبان نہیں ہوا۔یہ علماء حضرات کی بالغ نظری تھی اور تمام مکاتب فکر کے لوگوں نے ایسے حادثوں پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا۔سوال یہ ہے کہ کس طرح ان حرکتوں کا سدباب کیا جائے تا کہ آئے دن بے گناہ لوگوں کا جانی و مالی نقصان نہ ہو اور قوم کو لاشیں نہ اٹھانی پڑیں؟

ہماری رائے یہ ہے کہ جب تک ہم شیطان کبیر امریکہ سے اپنی جان نہیں چھڑائیں گے یہ خون خرابہ ہوتا رہے گا۔حکومت وقت اس قدر امریکہ کی گود میں چلی گئی ہے کہ بلیک واٹر کے متعلق امریکہ کا

وزیر دفاع رابرٹ گیٹس اپنے ملک میں بیان دے رہا ہے کہ بلیک واٹر نے امریکہ کا ساتھ عراق میں اچھی طرح سے دیا اور اب وہ پاکستان میں بھی امریکہ کی مدد کر رہی ہے۔ بلیک واٹر کے مالک اور بانی (ایرک پرنس) کا انٹرویو اخبارات میں چھپ چکا ہے کہ بلیک واٹر پاکستان میں کام کر رہی ہے اور اُس نے یہاں تک کہا کہ وہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک کے وزیر داخلہ کئی بار اخبارات میں بیانات دے چکے ہیں کہ بلیک واٹر پاکستان میں کام نہیں کر رہی ہے (چاہے نام بدل کر کام کر رہی ہو)۔ کس کی بات کو سچ مانا جائے اور کس کی بات کو جھوٹ سمجھا جائے۔ جب کہ ملک میں دہشت گردی کے کئی واقعات ہو چکے ہیں اور ملک کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کے بیانات آ چکے ہیں کہ یہ کام بلیک واٹر کا ہے۔ آئے دن امریکیوں کی اسلحے کے ساتھ ملک میں آزادی سے چلت پھرت بھی اخبارات کی زینت بن چکی ہے۔ لاہور میں پولیس نے امریکیوں کو اسلحے سمیت گرفتار کیا تھا مگر بعد میں ان کا پتہ تک نہ چلا۔ اسلام آباد میں بھی اس طرح کے واقعات اخبارات میں رپورٹ ہوئے تھے مگر سفارت خانے نے ان کو چھڑوا لیا۔ اسلام آباد میں امریکی میرین نے بھاری کرایہ پر بنگلے بڑی تعداد میں لیے اور ان میں رہائش پذیر ہیں۔ پشاور سے چلا ہوا اسلحہ سے بھرا ٹرک اسلام آباد پولیس نے پکڑا تھا جس کے ڈرائیور نے بیان دیا کہ یہ اسلحہ حیات آباد پشاور سے ایک امریکی نے لوڈ کروایا اور اسلام آباد کے سفارت کار کا فون نمبر بھی ڈرائیور کو دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ اسلام آباد جا کر فون کرنا وہ تمہیں وصول کر لیں گے۔ اخباری خبر کے مطابق پہلے سفارت کار نے انکار کیا پھر ٹرک کا پتہ بھی نہ چلا کہ کدھر گیا۔ بڑی تعداد میں کنٹینرز جو کراچی سے ناٹو کے لیے سپلائی لے کر جاتے ہیں وہ پاکستان میں گم ہو گئے ناٹو کے لوگوں کے خلاف مقدمہ بھی قائم ہوا پاکستان کی پارلیمنٹ میں ان کی تعداد بھی زیر بحث رہی ہے۔ سہالہ پولیس ٹریننگ سنٹر کے انچارج نے حکومت کو اطلاع دی تھی کہ امریکی فوجیوں نے سنٹر کے ایک حصے میں اسلحہ جمع کیا ہوا ہے وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ بیانات اخبارات کی زینت بنتے رہے۔ محبِ وطن میڈیا نے سوال اٹھایا تھا کہ کہوٹہ کے نزدیک جو پاکستان کا حساس علاقہ ہے امریکی فوجیوں کے رہنے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کو فوراً وہاں سے ہٹایا جائے۔ اس احتجاج پر امریکیوں کو وہاں سے ہٹایا گیا تھا۔ تربیلا کے قریب غازی میں امریکی فوجی اڈا اب بھی کام کر رہا ہے۔ ڈرون حملے شہباز/شمسی ائیر پورٹ سے اڑان پھرتے رہے ہیں۔ اس کی خبریں بھی اخبارات میں آتی رہیں، جو اب خالی کرالیا گیا ہے۔ کراچی پورٹ پر امریکہ کو گودی الاٹ کرنے کے کیا معنی ؟ ہر ملک اپنے ہاں آنے والے سامان کی چیکنگ کا حق رکھتا ہے ہمارا چیکنگ کا حق کہاں گیا؟ نہ جانے کیا کیا ہمارے ملک میں امریکہ سے آ رہا ہے اور کس کس دہشت گرد کے ہاتھ لگ رہا ہے اس کا جواب حکومت وقت کو دینا چاہیے۔ ہم لوگ امریکہ کے غلام بن گئے ہیں امریکہ دہشت گردوں سے ہماری فوج کو مذاکرات بھی نہیں کرنے دیتا بس ڈو مور کی رٹ لگا تا رہتا ہے۔ آخر کب تک ہم اپنے لوگوں سے لڑتے رہیں گے؟ کچھ مدت قبل ایک ٹی وی مذاکرے

میں آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جناب جاوید اشرف قاضی کا بیان چھپا تھا کہ ہمارے ایٹمی راز حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے سی آئی اے کے امریکی اہل کاروں کو آئی ایس آئی نے گرفتار کیا تھا اور اُن کو ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔

یہ خبر بھی اخبارات میں آئی تھی کہ دبئی کے راستے بلیک واٹر ایجنٹوں کی آمد پر سرکاری اداروں نے احتجاج کیا تھا اور دفتر خارجہ کو اس سے آگاہ کر کیا تھا۔ ان اداروں نے وزیر اعظم کو بھی خط تحریر کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو امریکہ میں پاکستانی سفارت خانے اور قونصل خانوں نے ویزے جاری کرنے سے انکار کیا تھا اب انہوں نے دبئی میں پاکستانی سفارتخانے سے پاکستان کا ویزہ حاصل کر لیا۔ حکام کو یہ بھی معلوم ہے کہ دبئی میں پاکستانی سفارتخانے نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا کیونکہ قاعدے کے مطابق کسی ہنگامی صورتحال کے باعث کسی تیسرے ملک کے شہری کو پاکستانی سفارتخانے سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ماہ کا ویزہ جاری کیا جا سکتا ہے مگر بلیک واٹرز کے ان ایجنٹوں کو چھ چھ ماہ کے ویزے جاری کر دیے گئے تھے تاہم حکام نے ان ایجنٹوں پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور ان کی کافی تعداد کو ملک سے نکال دیا گیا ہے۔ ریمنڈ ڈیوس کے واقعے کے بعد ویزوں کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی پاکستان میں رہنے والے امریکیوں سے پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ پاکستان مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے ثبوت بھی امریکی قیادت کو فراہم کئ جا چکے تھے گو کہ اب ان میں سے بیشتر کو ملک سے نکال دیا گیا ہے۔ امریکی بھارتیوں کو دبئی سے ویزے دینے کی تحقیقات قومی سلامتی کے ادارے نے کی اور ریکارڈ قبضے میں لے لیا تھا۔ ۲۳۰ غیر قانونی ویزے دیئے گئے تھے جن میں ۱۵۰ بھارتی اور ۱۸۶ امریکی شامل تھے۔ اخبارات میں خبر آئی تھی کہ امریکیوں کو کوئٹہ میں فوج رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ یہ بھی اطلاع ہے کہ امریکی قونصلیٹ کی تعمیر کے لیے بلیک واٹر کے ۵۰۰ اہلکار کوئٹہ پہنچ گئے۔ ۱۰۰ بنگلے کرائے پر لیے گئے ہیں۔ خطرناک اسلحہ اور جنگی آلات کے ہمراہ آمد سے ہمسایہ دوست ممالک کو بھی تشویش لاحق ہو گئی۔ ان ایجنٹوں کی ایک بڑی تعداد ان افراد پر مشتمل ہے جن کو واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے نے ویزا جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ دوسرے راستوں اور دبئی کے راستے سے پاکستان آنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں جوہری ماہر سمیت پر اسرار امریکی باشندوں کی موجودگی کا انکشاف بھی محب وطن میڈیا کر چکا ہے۔ اخباری خبر کے مطابق امریکی رسک اینڈ سیکورٹی نامی کمپنی کے بعض ملازم گرفتار ہو چکے ہیں اور وزارت داخلہ نے ملک کی نجی سیکورٹی کمپنیوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی بھی غیر ملکی سیکورٹی ایجنسی یا گروپ سے معاہدے نہ کریں۔ چاروں صوبوں اور گلگت بلتستان کے ہوم سیکریٹری سمیت اسلام آباد کے چیف کمشنر کے نام ایک مراسلے میں کہا گیا تھا کہ موجودہ سیکورٹی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی نجی سیکورٹی کمپنی کو کسی غیر

ملکی کمپنی یا گروپ سے معاہدہ کرنے کا این او سی جاری نہ کیا جائے۔اس کی وجہ ایک امریکی کمپنی رسک اینڈ سیکورٹی مینجمنٹ کنسلٹنٹ بتائی گئی ہے۔مراسلے میں حیرت انگیز انکشافات کیے گئے ہیں کہ امریکی کمپنی رسک اینڈ سیکورٹی مینجمنٹ کنسلٹنٹ کا سربراہ مائیکل بلیک نہ صرف تربیت یافتہ سیکورٹی ماہر ہے بلکہ اسے ایٹمی امور پر بھی مہارت حاصل ہے اور وہ عراق،افغانستان اور اسرائیل میں بھی کام کر چکا ہے۔یہ امریکی کمپنی پاکستان کے مختلف شہروں میں سیکورٹی سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ملوث ہے اور اس کے بعض ملازمین کو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے گرفتار بھی کیا تھا۔اس امریکی کمپنی کے ملازمین نے چی میکس فرم کے عہدیداروں کے بزنس کارڈ شائع کرا رکھے ہیں،اس فرم کے نام کو استعمال کرتے ہوئے یہ ملک کے مختلف حصوں میں آپریٹ کر رہے ہیں۔مراسلے میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ مسٹر بلیک اور اس کا ساتھی مسٹر رالویور صرف وزٹ ویزے پر ہیں اور انہیں بزنس سرگرمیوں کی کسی قسم کی اجازت نہیں دی گئی۔اس کمپنی کے ایک افسر اسٹیو واڈی نے داڑھی بڑھائی ہوئی ہے اور وہ اپنی شناخت چھپانے کیلئے شلوار قمیص پہنتا ہے۔یہ گوادر کا دورہ کرنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔یہ ساری معلومات حکومت کے ایک مراسلے کے ذریعے پرنٹ میڈیا کو معلوم ہوئیں جو انہوں نے اخبارات کو جاری کی تھیں۔سوال یہ ہے کہ کیا حکومت اتنی بے بس ہے؟ یہ جان کیری لوگر بل کے تحت امداد کے شاخسانے نہیں ہیں تو کیا ہے؟ ریمنڈ ڈیوس کا واقعہ جو ابھی تک میڈیا میں زیر بحث ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔پاشا صاحب کا بیان کہ ریمنڈ ڈیوس کو صدر اور وزیراعظم کے کہنے پر چھوڑا گیا تھا کیا یہ معمولی واقعہ ہے؟ بین الاقوامی میڈیا کے مطابق یہ ملک کو افراتفری میں مبتلا کر کے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو مغربی ملکوں کے حوالے کرنے کے امریکی منصوبہ کا ایک حصہ تھا جو اللہ نے فی الوقت ناکام کر دیا مگر امریکہ کے عزائم وہی پرانے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو مفلوج کر دیا جائے یا اسے مغربی ملکوں ربین الاقوامی کنٹرول میں دے دیا جائے۔ہماری حکومت سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود بھی بے بس ہے،یہ غلامی نہیں تو پھر کیا ہے؟ کچھ عرصہ قبل خود امریکی قانون ساز ادارے کے ارکان نے اعتراف کیا تھا کہ امریکی فوجی پاکستان میں خفیہ کاروائی کر رہے ہیں اُن کو فوراً پاکستان سے واپس بلایا جائے۔اِن ارکانِ کانگریس کا کہنا تھا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ امریکی فورسز کانگریس کی منظوری کے بغیر پاکستانی علاقوں کے اندر خفیہ طور پر کام کر رہی ہیں۔یہ خفیہ کاروائیاں کیا ہوسکتی ہیں؟ کیا ہمارے حکمرانوں کو معلوم نہیں؟ اس کا جواب حکومت وقت نے عوام کو دینا ہے۔

امریکیوں کا یہ بیان بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ پاکستان میں تخریبی کاروائیاں بلیک واٹر کر رہی ہے۔تحریک طالبان امریکا کی مقرر کردہ دہشت گرد تنظیم ہے اُس کا کام الزامات اپنے سر لینا ہے۔اسے

امریکی محکمہ خارجہ سے ہدایات ملتی ہیں اور پرویز مشرف کے دور میں اس کو اجازت دی گئی تھی۔ امریکہ کے ایک محقق صحافی وین میڈیسن نے انکشاف کیا تھا کہ اس تحقیق کے سامنے آنے پر کہ'' پاکستان میں افراتفری پھیلا کر اس کے ایٹمی اثاثوں کو مغرب کے کنٹرول میں دینا ہے'' ان کی تحقیقی ٹیم کو ایف بی آئی اور سی آئی اے کی جانب سے مسلسل دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور امریکی صحافی وڈورڈ کی کتاب (Safety from the Start) میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اعلیٰ سطح کے خفیہ اجلاسوں اور دستاویزات کے حوالے سے پتہ چلا ہے کہ سی آئی اے کے تربیت یافتہ تین ہزار افغان جنگجوؤں پر مشتمل فورس افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں القاعدہ اور طالبان کے خلاف کاروائیاں کر رہی ہے گو کہ پاکستانی دفتر خارجہ اور فوجی حکام نے یہ دعویٰ مسترد کیا تھا تاہم امریکی ایجنسی ایسوسی ایٹ پریس نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ سی آئی اے کی تیار کردہ یہ فورس ۸ برس سے سرگرم ہے جس کے اہلکاروں کو بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ امریکی صحافی وڈورڈ نے اپنی کتاب ''اوباما کی جنگ'' میں انکشاف کیا ہے کہ صدر زرداری نے سی آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ ڈرون حملوں سے ہونے والی اتفاقیہ ہلاکتوں اور نقصان امریکیوں کو پریشان کرتا ہے مجھے اس سے پریشانی نہیں ہوتی۔ صدر ملک کا درد رکھنے والا فرد ہوتا ہے مگر ہمارے صدر کو پاکستانیوں کے مرنے سے ذرا بھر پریشانی نہیں ہوتی، یہ شرم کا مقام ہے۔ انہیں مال بنانے سے وقت ملے تو پاکستانی قوم کے مرنے کا احساس ہو۔ چند دن قبل پشاور ایئرپورٹ سے مسلح امریکی گرفتار کیا گیا اور پھر اسے رہا کر دیا گیا۔ امریکی مصنفین ڈی بی گریڈی اور مارک امینڈرے نے اپنی ای بک ''دی کمانڈ، صدر کی خفیہ فوج'' میں انکشاف کیا ہے کہ امریکی وزارت دفاع نے آزاد کشمیر میں زلزلے کے فوری بعد جوائنٹ اسپیشل آپریشنز کمانڈ (جے ایس اوسی) کے اہلکاروں کو امدادی کاروائیوں کی آڑ میں آزاد کشمیر میں داخل کر دیا تھا۔ ناروے حکومت کی خاتون کا اپنی پارلیمنٹ میں غلطی سے زبان سے سے نکلنے والے بیان کہ ان کی فوج کا خفیہ ادارہ پاکستان میں جاسوسی کر رہا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ مغربی ملکوں نے ہمارے ملک کو باجگزار سمجھ رکھا ہے۔ اپنے اس بیان پر خاتون کو استعفیٰ دینا پڑا۔ ڈاکٹر شکیل آفریدی جیسے ملک کے غدار ان ہی خفیہ جاسوسوں نے بنائے ہیں اور بنا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے امریکہ میں ہونے والے سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے ناکام مذاکرات کے بعد امریکہ کا کہنا تھا کہ ہم نے خود فاٹا میں جاسوسی کا نظام قائم کر لیا ہے ہمیں آئی ایس آئی کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ حکمرانو! یہ کیا ہے؟ ہمارے ملک میں ہماری اجازت کے بغیر جاسوسی کا نظام قائم کر لینا، عجیب منطق ہے۔ پاکستان میں امریکی مداخلت کی داستان بہت طویل ہے، ہم نے اختصار سے کام لیا ہے۔

قارئین اس خرابی کا حل کیا ہے؟ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اس نام نہاد دہشت گردی کی امریکی جنگ سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا جائے۔ شمالی وزیرستان اور حقانی نیٹ ورک کے خلاف کاروائی جیسی ڈو مور کی بات نہ مانی جائے۔ ہم اپنے ازلی دشمن بھارت سے تو بار بار لایعنی مذاکرات کی بات کرتے ہیں اور پچھلے دنوں کابینہ نے قوم کے اختلاف کے باوجود اسے پسندیدہ ملک قرار بھی دیا ہے تو ہم اپنے ناراض شہریوں سے بات چیت کیوں نہیں کرتے؟ دینی جماعتوں کے سربراہوں نے حکومت کو کئی بار مذاکرات کرانے کی پیش کش کی ہے جس پر حکومت کو غور کرنا چاہیے اور ملک کے ناراض لوگوں سے فوراً مذاکرات شروع کرنے چاہئیں۔ بلیک واٹر یا (نام بدل کر کام کرنے والی سیکورٹی) پاکستان میں کس معاہدے کے تحت کام کر رہی ہے؟ اس کا معاہدہ ختم کیا جائے۔ رہے سہے امریکی اور دوسرے ملکوں کے جاسوسوں کو فوراً ملک سے باہر نکالا جائے۔ ڈرون حملے جن کی امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کے مطابق فوجی دور میں مشرف پیشگی اجازت دیتے تھے لیکن جمہوری حکومت آنے کے بعد پیشگی اجازت دینے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، کے سلسلے میں امریکہ سے بات کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں پیش کیا جائے۔ امریکیوں کو اسلحے کے ساتھ ملک میں پھرنے کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ کیا امریکہ میں کوئی پاکستانی اسلحے کے ساتھ گھوم پھر سکتا ہے؟ ہمارے صدر اور وزیر اعظم پارلیمنٹ کے سپریم ہونے کی صحیح بات کرتے ہیں لہذا پارلیمنٹ کی قرارداد اور کمیٹی کی سفارش جس میں کہا گیا ہے کہ امریکہ کے حوالے سے خارجہ پالیسی تبدیل کی جائے اس پر فوراً عمل کیا جائے۔ سلالہ پوسٹ پر ناٹو کے حملے کے بعد ناٹو پر جو پابندی عائد کی گئی ہے اسے کسی صورت بھی بحال نہیں ہونا چاہیے اور پارلیمنٹ کو بھی اپنے عوام کی خواہشات کا خیال رکھنا ہوگا بلکہ ناٹو کی سپلائی کا معاہدہ ختم کیا جائے۔ دوسرے ہوائی لاجسٹک سپورٹ کے معاہدے کو بھی ختم کیا جائے۔ جب ہم یہ سارے اقدام ایک ایک کر کے کریں گے تو امریکی مداخلت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس سے ملک میں امن وامان قائم ہوگا۔ خودکش حملے بھی بند ہو جائیں گے۔ قارئین! ان ہی واقعات کی وجہ سے ہم ملک کی سیاسی/دینی/سماجی جماعتوں کے سربراہوں سے درخواست کرتے ہیں کہ پاکستان میں ''گو امریکا گو'' تحریک جو جماعت اسلامی نے شروع کی تھی ہے اور اب دفاع پاکستان کونسل نے بھی شروع کر دی ہے یا جو دوسری پارٹیاں اپنے اپنے طور پر مہم چلا رہی رہیں، ایک دوسرے سے ہر ممکن طریقے سے اتحاد کریں اور اس اتحاد کو سیاسی نظریات سے ہٹ کر کامیاب کیا جائے۔ عوام سے بھی درخواست ہے کہ وہ اس مہم کو کامیابی سے ہمکنار کریں تا کہ امریکہ ہمارے ملک سے نکلے اور ہم چین کا سانس لیں۔ یہ عوامی دباؤ کے بغیر ممکن نہیں اس سے قبل جب بھی ملک کی پارٹیوں نے اتحاد کا مظاہرہ کیا

توقوم نے ان کا ساتھ دیا۔ پاکستانی قوم کی یکجہتی ''تحفظ ناموس رسالت'' کے اتحاد میں ہم دیکھ چکے ہیں اس لیے ہر محب وطن مذہبی اور سیاسی جماعت کو ایک دوسرے سے سیاسی اختلاف کے باوجود اس صحیح سمت کے کام کو سپورٹ کرنا چاہیے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ قوم امریکہ کے ظالم سے نجات پا سکے۔

تزکیہ نفس احمد جاوید

تزکیۂ نفس میں نوافل کا کردار (۲)

س: ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ نوافل کی ادائی کا باقاعدہ اہتمام کر سکیں لیکن ایسا ہو نہیں پاتا۔ پہلے تو یہ بتائیے کہ اس کے اسباب کیا ہیں؟ پھر اس باب میں کوئی مشورہ دیجیے کہ ان لوگوں کی یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟

ج: نوافل کی رغبت رکھنے کے باوجود اس کا عملی اہتمام نہ کر سکنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً:

۱۔ مصروفیات

۲۔ کاہلی

۳۔ غیر مستقل مزاجی

۴۔ کمزور قوت ارادی

۵۔ نفس کا وہ حیلہ جس کے ذریعے سے وہ آدمی کو نیکی کے خیال ہی سے مطمئن کر دیتا ہے اور عملاً اس کی نوبت نہیں آنے دیتا۔

اگر ہم منفی اسباب کو ترجیح نہ دیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے مسائل ان حضرات کو پیش آتے ہیں جو طبعاً اچھے ہوتے ہیں مگر ان کی قوتِ عمل ان کے داعیۂ خیر کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ ضابطے کی بات تو یہی ہے کہ یہ حضرات کسی دینی خطرے میں نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے کہ انہیں اس نیت کا ثواب مل جائے جس پر عمل نہ ہو سکا۔ تاہم کچھ تدابیر درج ذیل ہیں جنہیں استعمال میں لا کر قوی امید ہے کہ نوافل کی رغبت مزید بڑھے گی اور ان کی ادائی کی توفیق بھی حاصل ہو جائے گی:

۱۔ عشاء اور وتر میں فاصلہ پیدا کریں۔ وتر عشاء کی نماز سے متصل کر کے نہ پڑھے جائیں بلکہ کچھ وقفہ دے کر انہیں بستر پر جانے سے پہلے ادا کرنے کا معمول بنایا جائے۔ اس معمول پہ دو تین مہینے

گزر جائیں تو پھر وتر سے پہلے تہجد کی نیت کر کے دو چار نفلوں کا اضافہ کر لیا جائے۔ اس معمول پر بھی جب نسبتاً ایک لمبی مدت گزر جائے تو تہجد کے افضل اور مسنون وقت پر اٹھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں اگر ہفتے میں دو مرتبہ بھی کامیابی ہو گئی تو اللہ کے فضل سے پوری توقع ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ یہ شخص مسنون طریقے پر تہجد گزار بننے کی سعادت حاصل کر لے گا۔ تہجد کی توفیق میسر آ جائے تو دیگر اوقات میں نوافل کی ادائی کا معمول بالکل سہل ہو جاتا ہے لیکن اگر تہجد کے بعد کسی اور نفل کا ارادہ نہ بھی کیا جائے تو بھی نفل گزاری کا حق عمدہ طریقے سے اور اعلیٰ معیار پر ادا ہو گیا۔

۲۔ قرآن شریف کا ضروری فہم حاصل کرنے کے لیے باقاعدگی کے ساتھ کوئی وقت مخصوص کر کے محنت کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن سے تعلق میں گہرائی پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی جائے۔ اس کے نتیجے میں عبادات کا جذبہ بڑھے گا اور ایک پرزور تقاضے کی شکل اختیار کر لے گا، ان شاء اللہ۔ یاد رہے کہ عبادت ہو یا اطاعت، اس میں رسوخ پیدا کرنے کا کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جو قرآن سے نکل کر قرآن ہی پر ختم نہ ہوتا ہو۔ فہم سے راستہ نکلتا ہے اور ذوق سے مکمل ہوتا ہے۔ اس تدبیر کی یہی بنیاد ہے۔

۳۔ کوئی ایک وقت ایسا مقرر کر لینا چاہیے جس میں کچھ حصہ تعلیم کے لیے ہو اور کچھ ذکر و عبادت کے لیے۔ وہ وقت مقرر ہو جائے تو پھر اس وقت میں یہی کام انجام دیے جائیں اور کسی شدید عذر کے بغیر اس معمول کی خلاف ورزی نہ ہونے دی جائے۔ یہ وقت چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو لیکن پابندی سے اس کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ ایسا کر لیا تو نوافل کی ادائی کا کم از کم ایک موقع تو روزانہ نکل آئے گا۔

۴۔ سیرت النبیؐ کا مطالعہ بلکہ باقاعدہ مطالعہ --- اللہ اور اللہ کے دین کی طرف رغبت پیدا کرنے کا یہ نہایت موثر ذریعہ ہے۔ اس رغبت میں مطالعۂ سیرت کی تکرار سے وہ صلاحیت ضرور پیدا ہوتی ہے جو کثرت عبادت پر قائم ہونے اور رہنے کے لیے درکار ہے۔

۵۔ کثرت ذکر یعنی اللہ کو رہ رہ کر پکارنا اور یاد کرنا۔ اس سے عبادت کا شوق بھی بڑھتا ہے اور اسے انجام دینے کی طاقت بھی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کثرت عبادت کی بنیاد کثرت ذکر پر نہ ہو۔

۶۔ اچھے ذاکر و شاغل نمازیوں کی صحبت۔ وہ لوگ جن کا ذکر چل رہا ہے ان کی خواہش کی تکمیل کا یہ راستہ سب سے مختصر ہے۔ نفل گزاروں کی صحبت کسی کو نفل کی ادائی کے قابل بنانے کا سب سے آسان نسخہ ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ یہ صحبت باقاعدہ ہونی چاہیے اور قدرے تفصیلی بھی، یعنی ان صحبتوں میں روز جانا چاہیے اور کوئی ایک گھنٹہ بیٹھنا چاہیے۔ اس کے نتائج نوافل کی ادائی کی تمنا رکھنے والے آدمی پر ہفتوں میں نہیں بلکہ دنوں میں مرتب ہو سکتے ہیں۔

۷۔ اگر ممکن ہو تو کسی مسجد سے انتظامی تعلق پیدا کر لینا چاہیے۔ اس طرح مسجد میں نسبتاً زیادہ وقت گزرے گا جس سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

س: آیت کریمہ، ''ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء و المنکر'' کا کیا مطلب ہے؟ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کا ایک بڑا فائدہ بتایا ہے جس کا تعلق تزکیۂ نفس سے معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ بتایئے کہ فحشاء اور منکر سے نماز کس طرح سے روکتی ہے؟ اور کیا ان سے رک جانے پر تزکیے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے؟

ج: غیر مشروط حصول لذت اور سرکشی دو ستون ہیں جن پر نفس کی امارگی کی عمارت کھڑی ہے۔ فحشاء کا تعلق پہلے سے ہے اور منکر کا دوسرے سے۔ نماز چونکہ بندگی کی تمام جہات کا وہ خلاصہ ہے جس میں ہر جہت مکمل ہو کر سمائی ہوئی ہے اس لیے اس کی تاثیر بھی بندے کے نفس کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تزکیے کا مقصود یہ ہے کہ پرستش احسان کے ساتھ اور اطاعت آمادگی کے ساتھ میسر آ جائے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ معیاری نماز تزکیے کے ان انتہائی مقاصد کے حصول کی شرط بلکہ ضامن ہے۔ تفصیل میں جانے سے پہلے ایک نقطہ یہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس آیۂ مبارکہ میں ایک واضح دلالت اس طرف بھی ہے کہ نماز میں پرستش اور اطاعت کا نقطۂ یکجائی ہے۔ اس ایک عمل میں بشرط صحت و کمال پرستش بھی اپنے منتہیٰ کو پہنچ جاتی ہے اور داعیۂ اطاعت بھی اپنے حقیقی مقتضیٰ کو پا لیتا ہے یعنی اپنی اصل پر قائم ہو جاتا ہے۔ یہ دو تاثیرات بندگی کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے نفس کی تمام ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ احسان لذت کوشی کی جبلت کی تہذیب کرتا ہے بلکہ اسے اعلیٰ روحانی لذات سے متعارف کروا دیتا ہے جبکہ ذوق اطاعت سرکشی کے مادے کو فنا کرتا ہے یا اس کے ابھرنے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔

ہم پہلے تفصیل سے دیکھ آئے ہیں کہ اللہ کی عبادت و اطاعت بندگی کی بنیادیں ہیں۔ اس گفتگو کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہاں نماز کی مجموعی خاصیت کی طرف اشارہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز اپنی صورت اور اپنے معنی کے اعتبار سے ایک ایسا عمل ہے جس میں یہ دونوں اصول یکجا اور کامل حالت میں کارفرما ہیں۔ اپنی صورت کے لحاظ سے یعنی خضوع وغیرہ کے پہلو سے نماز بندے کو گویا یہ مشق کراتی ہے کہ نفس کو ساکن کیسے رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے معنی یعنی خشوع وغیرہ کے اعتبار سے نماز نفس کے اطمینان کا تجربہ بالتکرار کراتی ہے۔ نماز اگر ذرا بھی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کی جائے تو یہ دونوں اوصاف ہر شخص اپنی کوشش اور بساط کے مطابق واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ اب دیکھیے نفس کا ساکن ہونا اس کی خلقی سرکشی کا واحد علاج ہے اور اطمینان اس کی لذت پرستی کا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں ہم نے نماز کو پرستش اور فرمانبرداری کا منتہیٰ بتایا۔

اسلام اور مغرب

پروفیسر محمد زاہد صدیق مغل ٭

سائنسی علمیت اور اسلام (۲)

حامیان سائنس مسلم مفکرین کے دلائل کا جائزہ

۲۔ سائنس اور سرمایہ داری کے تعلق کو حادثہ سمجھنے کی غلط فہمی

سائنسی علمیت کو سرمایہ دارنہ نظام اور خواہشات انسانی کی تکمیل کے لیے سرگرم ذہنیت کی پیداوار سمجھنا کوئی بے بنیاد تصور نہیں اور نہ ہی اس کا انسانی خواہشات کی تکمیل اور سرمائے میں اضافے کی جدوجہد میں مصروف ہونا کوئی حادثہ ہے کہ جسے بدلنا ممکن ہو بلکہ یہ عین سائنسی معنویت کا اظہار ہے اور علم کو اس کی معنویت سے جدا متصور کرنا بلا شک وشبہ ایک مہمل دعویٰ ہے۔ اصول فقہ کے درست استعمال سے شارع کی رضا معلوم ہوجانا کوئی حادثہ نہیں، علم تصوف کے غلبے سے نفسانی خواہشات کا کم ہوجانا کوئی حادثہ نہیں، بالکل اسی طرح سائنس کا سرمایہ داری کی خدمت کرنا کوئی حادثہ یا سازش نہیں بلکہ سائنس عین اسی چیز کو ممکن بناتی ہے اور پچھلی تین سو سالہ انسانی تاریخ یہی ثابت کرتی ہے کہ جن معاشروں میں سائنسی علمیت غالب ہوئی وہاں حرص وحسد، نفس پرستی، حب دنیا، حب مال وغیرہ ہی کی اقدار پختہ ہوئیں۔ سائنس وٹیکنالوجی کسی خلا میں تخلیق نہیں ہوتیں اور نہ ہی یہ آسمان سے من وسلویٰ کی طرح برستی ہیں بلکہ انسانی تعلقات کے ایک مخصوص نظم معاشرت ہی میں ان کی تخلیق، تشکیل وترویج ممکن ہوتی ہے (۱۲)۔ علم معاشیات کی زبان میں اسے یوں کہا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی سرمایہ دارانہ پیداواری نظم (production process) کے باہر سے نہیں بلکہ اس کے اندر سے برآمد ہوتی ہے یعنی Technology is not exogenous, but endogenous variable (۱۳)۔ ہائیک (لبرل سرمایہ داری کا موجودہ سب سے بڑا حامی) اسی بات کو یوں کہتا ہے کہ سائنسی علم سرمایہ دارانہ نظم معاشرت یعنی مارکیٹ (جسے وہ catalaxy سے تعبیر کرتا ہے) کے اندر پیدا ہوتا ہے (۱۴)، ماؤ زے تنگ (اشتراکی سرمایہ داری کا

چمپئن) برملا کہتا ہے کہ سائنسی علم پیداواری عمل سے برآمد ہوتا ہے[۱۵]۔ سائنس کا سرمایہ داری سے تعلق مغرب کے تمام نامور مکتبہ ہائے فکر کے ہاں بالکل واضح ہے، لیکن چونکہ ہمارے مفکرین کسی علمی منہج (epistemological discourse) کی بجائے دوسرے اور تیسرے درجے کے مغربی مصنفین کی تحریروں پر اکتفا کرتے ہیں اس لیے سائنس پر ان کا تجزیہ محض سطحی اور عامیانہ ہی رہتا ہے[۱۶] (اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اسلامی علمیت سے واقفیت کے لیے فقہ واصول فقہ وغیرہ کی امہات الکتب

☆ نیشنل یونیورسٹی آف ایمرجنگ سائنسز (فاسٹ) اسلام آباد

کے بجائے اردو کی چند کتابیں یا دور جدید میں لکھنے والے چند مفکرین کو پڑھ کر اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے)۔

یہ دعوی کہ سائنس اور اسلام کے درمیان تعلق مفاہمت کا ہے وہی شخص کر سکتا ہے جس کی نظر فلسفہ سائنس پر نہ ہو اور وہ سائنس کو ایک غیر اقداری علم تصور کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا کہ سائنس محض غور وفکر کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص ذہنیت (rationality) کے ماتحت غور وفکر کا نام ہے کیونکہ ہر علم کا حامل (knowledge bearer) انسان ہوتا ہے۔ کسی شے کے بارے میں غور وفکر کی نوعیت اور مقدار کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ غور وفکر کرنے والے شخص کی مابعد الطبیعیات اور مقصد کیا ہے۔ سائنس کوئی ہتھوڑی نہیں کہ جسے جو چاہے جیسے مرضی استعمال کر لے بلکہ یہ ایک علمیت ہے اور ہر علمیت ایک مخصوص مقصدیت وعقلیت (objectivity and rationality) کی حامل ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے معتبر غور وفکر وہ ہے جس کا مآل کار 'عبرت واصلاح' ہو نہ کہ تسخیر کائنات اور انسانی ارادے کا تسلط قائم کرنے کی خواہش۔ درحقیقت ہر علمیت 'کامیاب زندگی' کے ایک مخصوص تصور کو ممکن بنانے کا طریق کار وضع کرتی ہے اور تصور کامیابی کے مابعد الطبیعیاتی تناظر میں تبدیلی کے بغیر کسی معاشرے میں ایک علمیت کے بجائے کسی دوسری علمیت کا غالب آ جانا ممکن ہی نہیں۔ گو کہ مثالیں مجرد تصورات (abstract ideas) کا مکمل احاطہ نہیں کر پاتیں لیکن اوپر بیان کی گئی بات علوم اسلامیہ پر غور کرنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً علم تصوف محض چند معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ نفس انسانی کو ارادۂ الٰہی کے سپرد کر دینے پر تیار کرنے کی علمیت ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ کسی معاشرے میں تصوف کا غلبہ ہو لیکن افراد دنیا پرست اور خواہشات کے اسیر ہوں۔ علم تصوف کے غلبے سے وہی شخصیت برآمد ہو سکتی ہے جس کا نقشہ احادیث کی کتاب الرقاق اور کتاب الزہد میں پیش کیا گیا ہے۔

اگر سائنس محض تاریخ انسانی کا تسلسل ہے اور اسلام اور سائنس کے درمیان تعلق مفاہمت وہم آہنگی کا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ سائنس کا 'تصور کامیابی' بھی وہی ہے جسے اسلام کامیابی کہتا ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سائنس کے 'کامیاب زندگی' کے تصور میں 'رضائے الٰہی' اور 'زندگی بعد

الموت' کا حوالہ ہی سرے سے مفقود ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی سائنسی مضمون (scientific discipline) بشمول فزیکل وسوشل سائنسز میں گناہ، موت، معنویت موت اور زندگی بعد الموت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سائنسی علمیت میں زندگی بعد الموت کے حوالے کے بغیر اسلام کے تصور کامیابی کو سائنس میں تلاش کرنا خوش فہمی تو ہوسکتی ہے مگر کوئی علمی کاوش نہیں۔ یہ تو ہوئی نظریاتی بات، اس فرق کو عملی زندگی میں دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ نہ جائیے، ذرا اپنے معاشرے کے سرکاری و نجی کالجز اور یونیورسٹیوں میں جا کر سائنس اور ٹیکنالوجی، سوشل سائنسز اور بزنس ایڈمنسٹریشن وغیرہ کے طلباء کے ساتھ چند دن گزار آیئے آپ کو ہماری بات کا یقین ہو جائے گا کہ ان علوم میں سرایت کی ہوئی سرمایہ داری نے کس طرح ہمارے طلباء کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ آخر دونوں نظام ہائے علم سے دو متضاد قسم کی شخصیتیں کیوں وجود میں آتی ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ سائنسی علمیت کے نتیجے میں اسلامی شخصیت وقوع پذیر نہیں ہو پاتی؟ کیا سائنس وٹیکنالوجی کی بالادستی پر قائم ہونے والے نظام علم کی دنیا میں اپنی زندگی کے پندرہ سال گزارنے کے بعد ایک طالب علم میں للّٰہیت، محبت رسول ﷺ، شوق عبادت، طہارت، تقویٰ، خوف آخرت، عفت، حیا، غیرت، ایثار، شوق شہادت، توکل، صبر، عزیمت وغیرہ کی صفات پیدا ہونے کا کوئی ذرہ بھر امکان بھی ہوتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ عمر عزیز کا اس قدر طویل حصہ صرف کرنے کے بعد بھی اس متاع عظیم میں سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ سائنسی علم بھی اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے جہاں اسلام لے جانا چاہتا ہے؟ اگر کسی شخص نے ابھی تک جہنم کا نام جنت نہیں رکھا ہے تو اسے اس سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔ سائنسی علمیت کے حامل 'ہر معاشرے' میں مادیت پرستی (materialism)[۱۷] کے ظہور کو محض حادثہ سمجھنا بذات خود ایک خوشنما حادثہ ہے نہ کہ کوئی علمی استدلال۔

مسلم مفکرین کے نزدیک سائنس کو 'سرمایہ دارانہ علم' کہنا ایک غیر علمی دعویٰ ہے کیونکہ ان کے خیال میں علم کی مشرقی و مغربی تفریق مہمل بات ہے۔ مگر ہم صرف اتنا ہی دعویٰ نہیں کرتے کہ سرمایہ دارانہ علمیت ہونا ممکن ہے بلکہ ہمارے نزدیک سرمایہ دارانہ علمیت ہونا امر لازم ہے۔ اگر سرمایہ داری ایک نظام زندگی ہے، تو پھر لازماً اس کی کوئی نہ کوئی علمیت ضرور ہونی چاہیے کیونکہ بغیر علمیت نظام زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ ہر نظام زندگی جس اصول پر انسانی زندگی کو فرد، معاشرے اور ریاست کی سطح پر مرتب کرنا چاہتا ہے اس اصل الاصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فیصلے کرنا تب ہی ممکن ہوتا ہے جب ایک علمیت موجود ہو۔ مثلاً اسلامی نظام زندگی تب ہی ممکن ہے جب فقہ و اصول فقہ نامی کوئی علم موجود ہو جو یہ بتائے کہ ان گنت انسانی اعمال سے شارع کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ بالکل اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام انسانی زندگی کو آزادی یعنی سرمائے میں لامحدود اضافے کے اصل الاصول پر مرتب کرتی ہے اور وہ علم جو انسانی حیات کی اس تشکیل و ترتیب کو ممکن بناتا ہے اسے سائنس کہتے ہیں (جیسا کہ ہم نے اپنے پہلے مضمون میں تفصیل سے فزیکل اور سوشل سائنسز پر بحث کرتے ہوئے واضح کیا ہے)۔ اگر بالفرض یہ بات

ٹھیک ہے کہ سائنس سرمایہ دارانہ علمیت نہیں تو پھر اس کی علمیت کیا ہے؟ اور اگر اس کی کوئی علمیت ہی نہیں تو پھر سرمایہ داری کن معنی میں نظام زندگی ہے؟ اس مقام پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے سائنسدان سرمایہ دارانہ افکار کے غلبے سے پہلے سائنسی تحقیقات کی داغ بیل ڈال چکے تھے (مثلاً نیوٹن اور بیکن وغیرہ) جس سے ثابت ہوا کہ سائنس سرمایہ داری کے بغیر بھی ممکن ہے۔ مگر بنیادی اور قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا سرمایہ داری کے غلبے کے بغیر نیوٹن کو وہ تاریخی حیثیت و مقام ملنا ممکن تھا جو اسے اب حاصل ہے؟ کیا سرمایہ دارانہ ترقی کے بغیر سائنسی علمیت کے غلبے کا کوئی امکان موجود ہے؟

یہ فرض کرنا کہ اسلام اور سائنس علم کے دو ایسے علیحدہ دائرے ہیں جن کی وجہ سے انسانی زندگی میں کوئی مغایرت پیدا نہیں ہوتی در حقیقت علمیت اور انسانی زندگی کی کلیت کا ادراک نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ سائنس اور اسلام رویے نہیں بلکہ علم ہیں اور علم پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ کسی معاشرے میں دو مختلف الانواع علمیتیں بیک وقت کارفرما ہوں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو افراد لازماً منافقانہ طرز زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسا کہ مسلم ممالک کے حال سے واضح ہے کہ جو نہ تو پوری طرح اسلام کے ہو رہتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر مغرب کو اپنا پاتے ہیں۔ اولاً تو مسلم مفکرین کا اسلامی اقدار کی حامل سائنس کے امکان کا دعویٰ ہی محل نظر ہے، لیکن اگر اس امکان کو مان بھی لیا جائے تب بھی سوال یہ ہے کہ ایسی سائنس ہے کہاں؟ جب غیر سرمایہ دارانہ (Non-capitalist) سائنس بنا لی جائے گی تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لیکن یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے مفکرین نے موجودہ سائنس ہی کو اسلامی ثابت کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ہم حامیان سائنس کا یہ دعویٰ ماننے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے کہ ممکن ہے سائنس اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ ایک تاریخی حادثہ ہو جیسا کہ فئیر ابینڈ وغیرہ کا بھی خیال ہے (یعنی ہو سکتا ہے واقعی یورپ میں مذہب بیزاری، سرمایہ دارانہ افکار کا فروغ، سیاسی انقلابات، سائنسی تحقیقات کا عروج، صنعتی انقلاب، وغیرہم کسی حادثے کے تحت یکے بعد دیگرے رونما ہوئے ہوں) لیکن امر واقعہ (ground reality) یہی ہے کہ دور حاضر میں جو شے عملاً غالب ہے وہ سرمایہ دارانہ سائنس کے سوا کچھ نہیں اور یہ سائنس اپنے غلبے کے لیے اسلامی دلیلوں کی بالکلیہ محتاج نہیں اور نہ ہی ہمارے دلیلیں نہ دینے سے اس کی ترقی رک جائے گی۔ ان حالات میں کسی فرضی سائنس کے امکان کو بنیاد بنا کر سائنس کی جو بھی مذہبی توجیہہ پیش کی جائے گی [۱۸] وہ موجودہ غالب سائنس ہی کی تائید و تصویب (endorsement and reinforcement) کا باعث بنے گی کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور سائنس فی الحال موجود ہی نہیں۔ یہ خدشہ کہ کسی غیر سرمایہ دارانہ سائنس کی اسلامی توجیہات موجودہ سائنس ہی کی حاکمیت کا سبب بنیں گی اس حقیقت سے عیاں ہو جاتا ہے کہ 'اسلامی سائنس' کے نام پر جو بھی نقشہ تیار کیا جائے گا وہ غالباً ویسا ہی ہوگا جیسا 'اسلامی معاشیات و بینکاری' اور 'اسلامی جمہوریت' کا ہے جس میں تمام سرمایہ دارانہ اقدار کو اسلامی لبادہ اوڑھا کر ان پر 'اسلامی' کا لیبل چسپاں کر دیا

گیا[۱۸]۔ ہماری حالت بھی عجیب ہے کہ تاریخ واضح طور پر ہمیں یہ سبق دے رہی ہے کہ سائنس ہر جگہ سرمایہ داری کے غلبے اور مذہب کے زوال کا باعث بنی مگر ہم پھر بھی اسی کے حق میں تاویلیں تراش رہے ہیں۔ ہمارے مفکرین کی کمزوری یہ ہے کہ وہ سائنس کے ساتھ اسلامی رویہ حکمت عملی کی بجائے آئیڈیل بنیادوں پر استوار کرنے پر مصر ہیں۔

۳۔ سائنس بطور تبلیغ اسلام کا ذریعہ

سائنس کے حق میں ایک دلیل یہ بھی تراشی گئی ہے کہ یہ تبلیغ اسلام کا بہت اہم ذریعہ ہے۔ وہ ایسے کہ سائنس جن حقائق کو آج سامنے لا رہی ہے قرآن انہیں چودہ سو برس قبل ہی بیان کر چکا ہے۔ سائنسی انکشافات اور اسلامی تعلیمات میں مفاہمت دکھانے کا یہ رویہ اب ایک جنون کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس موضوع پر بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں مرتب کی جا چکی ہیں جن میں سے ایک اہم حوالہ موریس بوکائیے کی کتاب The Bible, Quran and Science ہے جسے فخریہ انداز سے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقیقتاً امر واقعہ وہی ہے جو مدعین سائنس بیان کرتے ہیں تو آج تک دنیا میں لاکھوں سائنسدانوں میں سے کتنے مسلمان ہو گئے؟ نیز جن معاشروں میں سائنسی علمیت غالب آئی وہاں مذہبیت غالب آئی یا انسانی ارادے کی بالادستی؟ آخر ان معاشروں میں مذہبی اقدار مثلاً للّٰہیت، عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تقویٰ، حیاء، زہد و قناعت وغیرہ کیوں بے وقعت ہو کر رہ گئیں؟ سائنس اور اسلام میں مفاہمت ثابت کرنے کے لیے مسلم مفکرین کوئی علمیاتی منہج اپنانے کی بجائے چند اجزاء کی مماثلتوں کو بنیاد بناتے ہیں جیسا کہ اس دلیل سے عین واضح ہے کہ سائنس کی فلاں بات اسلام کے مطابق ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ اصولی بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ چند اجزاء کی مماثلت سے کل (whole) کی مفاہمت ثابت نہیں ہوتی اور اسی اصول کو نظر انداز کرنا ہمارے مفکرین کی بنیادی غلطی ہے۔ اسلام میں ایسی پیوندکاریوں کی مثالیں دیکھنا ہوں تو 'اسلام اور ہیومن رائٹس'، 'اسلام اور ٹی وی'، 'اسلام اور انٹرنیٹ'، 'اسلام اور جمہوریت'، 'اسلام اور بینکاری' وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھی جانے والی بیشتر تصانیف کا مطالعہ کر لیجیے۔

دوسری بات یہ کہ جیسے مسلم مفکرین کے خیال میں سائنس کے ذریعے اسلام کا اثبات ہوتا ہے بالکل اسی طرح عیسائی مفکرین کے خیال میں عیسائی تعلیمات بھی سائنس سے ثابت کی جا سکتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عیسائی مفکرین نے موریس بوکائیے صاحب کی کتاب کا جواب سائنسی تحقیقات ہی کی روشنی میں دینے کی کوشش کی ہے[۲۰]۔ ایسے مذہبی مفکرین کی حالت بھی عجیب ہے کہ جہاں سائنس کی کوئی بات بظاہر اپنے مذہب کے مطابق دکھائی دے وہاں تو بغلیں بجاتے ہیں لیکن جونہی سائنس مذہب کے خلاف نظر آئے تو تاویلات کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ سائنس کے ذریعے مذہبی تعلیمات کا اثبات کرنا ان معنی میں

لا حاصل طریقہ ہے کہ سائنس میں حتمی علم حاصل کرنے کا کوئی طریقہ ہے ہی نہیں بلکہ اس کی تمام تر معلومات ظنی (probably true) اور ارتقائی (evolutionary) ہوتی ہیں (۲۱)۔ جب سائنس کی کوئی بات حتمی ہوتی ہی نہیں تو پھر یہ بات کہ سائنس کی فلاں تحقیق مذہب کے مطابق ہے اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتی، بلکہ یہ تو نہایت خطرناک طرز استدلال ہے جو اپنے اندر یہ مضمرات لیے ہوئے ہے کہ دین کی ہر بات قابل تشکیک اور قابل رد ہے کیونکہ سائنس کے نزدیک علم وہی ہے جسے تجربے میں لاکر غلط ثابت (falsify) کرنا ممکن ہو۔ اسلام کو سائنسی علم کی کسوٹی پر پرکھنے کا منطقی نتیجہ یہ مان لینا ہے کہ تمام تعلیمات اسلامی بذریعہ انسانی تجربات اصولاً قابل رد ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ہر چند سال کے بعد واضح نصوص واحکامات تک میں تبدیلی لاکر انہیں ازسرنو مرتب کیا جائے۔ لیکن جس علم میں بذات خود کسی بات کے حق اور باطل ہونے کی جانچ کرنے کا کوئی قطعی معیار موجود ہی نہ ہوا سے بنیاد بنا کر قرآن وسنت کے معنی متعین کرنے کا کیا مطلب؟ تعلیمات اسلامی کو سائنسی تحقیقات کا پابند بنانے کا مطلب یہ ہوا کہ دین کسی معین شے کا نام نہیں بلکہ اس کے وہی معنی درست ہوں گے جو سائنسی ارتقاء کے نتیجے میں طے پائیں گے اور ظاہر ہے یہ دعوی دین کو کھیل بنا دینے کے مترادف ہے (۲۲)۔ پھر اہم بات یہ بھی ہے کہ اس طرز استدلال کے نتیجے میں اسلام نہیں بلکہ سائنس کی بالادستی قائم ہوتی ہے کیونکہ یہاں قرآن کو سائنسی کسوٹی پر کسا جارہا ہے گویا سائنس حقیقت معلوم کرنے کا کوئی ایسا طریقۂ علم ہے جو وحی سے ماقبل اور بلندتر ہے اور جس کی روشنی میں وحی کو سمجھا جانا چاہیے۔ دھیان رہے کہ ہم سائنس کی مخالفت اس خدشے کی بناء پر نہیں کررہے کہ اگر گزشتہ معلومات میں پیہم بہتری کے امکان کو تسلیم کرلیا گیا تو مختلف مسائل میں مذہب کے پیش کردہ حتمی تصورات خطرے میں پڑ جائیں گے، ہمیں سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں مذہبی تعلیمات کے فسخ ہوجانے کا کوئی خدشہ لاحق نہیں کیونکہ ہم سائنس کی حدود اچھی طرح پہچانتے ہیں، ہمیں تو فکر اس ذہنیت کے فروغ کی ہے جو سائنس لازماً اپنے ساتھ لاتی ہے (۲۳)۔

تبلیغ اسلام کے امکانات بذریعہ سائنس ثابت کرنے کی سب سے بڑی خامی سائنس کو اس کی مقصدیت سے الگ ایک مجرد (abstract) شے فرض کرکے اس کے ایک فائدے کو بیان کردینا ہے۔ ہر مغربی ادارے اور علمیت کو اس کے تناظر (context)، مقصدیت (objectivity) اور نتائج (consequence) سے علیحدہ کرکے انہیں اسلامی تعلیمات پر منطبق کرنا مسلم مفکرین کی بنیادی خامی ہے۔ اس رویے کی مثالیں دیکھنا ہوں تو ہیومن رائٹس، جمہوریت، بینکاری، کارپوریشن وغیرہ کی اسلام کاری کے لیے فراہم کردہ اسلامی تاویلات وتعبیرات پر غور کرلیجیے۔ اس رویے کی غلطی سمجھنے کے لیے دور حاضر میں NGOs کے تحت برپا 'عورتوں پر ظلم ختم کرانے' کی جدوجہد کو اسلامی پیرائے میں دیکھنے کی

مثال پر غور کریں کہ جب اس جدوجہد کو یہ کہہ کر اسلامی جواز فراہم کیا جاتا ہے کہ 'اسلام بھی عورتوں پر ظلم کے خلاف ہے'۔ ظاہر ہے اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا ہے کہ عورتوں پر ظلم نہیں ہونا چاہیے، مگر اصل سوالات یہ ہیں کہ ان NGOs کے نزدیک 'ظلم' کیا ہے، نیز اس ظلم کو ختم کرکے وہ 'کون سا تصورعدل' قائم کرنا چاہتی ہیں؟ کیا وہ ظلم کا خاتمہ اس لیے چاہتی ہیں کہ 'مردوں کی قوامیت' پر مبنی 'صالح اسلامی خاندان' کا احیاء ممکن ہوسکے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ان کی جدوجہد کا مقصد تو عورت کو گھرداری کے کام کاج سے فارغ کرکے 'لیبر' (labor) بنانا ہے تو آخر ایسی جدوجہد کا اسلام سے کیا لینا دینا؟[۲۴] NGOs کے اس سارے دھندے کا مقصد تو سرمایہ دارانہ عدل اور معاشرت کا قیام ہے۔

سائنس کی مثال میں بھی اسے اس کی کلیت اور انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے مجموعی اثرات سے مجرد کرکے ایک اضافی فائدے کو بنیاد بنا کر اس کا اسلامی جواز فراہم کیا گیا ہے۔ اصلاً سائنس کس قسم کی ذہنیت پیدا کرتی ہے یہ سمجھنا ہو تو انگریزی زبان میں بننے والی سائنس فکشن فلمیں دیکھیے۔ ذرا قریب کی مثال دیکھنا ہو تو تین سال قبل پاکستان میں آنے والے زلزلے کی حقیقت کے بارے میں مذہبی اور سائنسی طبقے کے خیالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ایک مذہبی ذہن کے لیے زلزلہ کے معنی یا تو خدائی تنبیہ ہے یا اس کی آزمائش اور یا پھر اس کا عذاب اور حاصل یہ ہے کہ انسان توبہ کرکے اپنی اصلاح کرے۔ اس کے مقابلے میں سائنس کے نزدیک انسانی ارادے سے ماوراء کسی واقعے کی معنویت تلاش کرنا ہی مہمل تصور ہے، اس کے نزدیک معنی کا واحد منبع انسانی نقطہ نگاہ ہے اور اس ارادۂ انسانی کے نقطہ نگاہ سے علت و معلول کی صورت میں ظاہر ہونے والے ہر قانون کا مطلب ہوتا ہے 'انسانی ارادے کی تکمیل کی حد' (limit to freedom)۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی ذہنیت کا حامل شخص زلزلے کے حادثے کو کسی خدائی تنبیہ یا سزا وغیرہ کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں دیکھتا ہے کہ یہ حادثہ اس کے ارادے اور خواہشات سے علی الرغم اس کی زندگی اور اس کے سارے سکھ چین چھین لیتا ہے، گویا یہ حادثہ اسے اس کے ارادے یا آزادی کی ایک نئی حد بتا رہا ہے۔ لہٰذا اب وہ اس فکر میں لگ جاتا ہے کہ جتنا جلد ہوسکے اس حادثے کا سبب تلاش کرکے اسے اپنے قابو میں لے آئے تاکہ اس کے ان اثرات سے بچا جا سکے جو اس کی خواہش کے خلاف رونما ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ انسانی خواہشات کی تکمیل کا سامان فراہم کرنے کے لیے ارادۂ انسانی کو کائنات پر مسلط کرنے کی ذہنیت (subordination of nature to human will for the maximum satisfaction of desires) ہی موجودہ سائنس کی اصل حقیقت و ماہیت ہے۔ اسی طرح سائنس کا یہ تصور کہ کائنات ایک خودکار مشینی نظام

(self-governing system) ہے جس میں رونما ہونے والی تبدیلیاں علل ومعلول(cause and effect) کے قوانین کی روشنی میں سمجھی جاسکتی ہیں انسان کو ان قوانین سے ماوراء کسی غیر مرئی ہستی سے لاتعلق کر دیتی ہیں۔علل ومعلول کی اس مادی تعبیر سے متاثرہ ذہنیت کے لیے'ایمان میں اضافہ' ، 'دعا' اور 'توکل علی اللہ' محض رسمی باتیں بن کر اصل شے مادی ذرائع اور عددی قوت کا حصول ٹھہرتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ'دعا' کے ساتھ 'دوا' کی فکر بھی کرنی چاہیے مگر کم اہم شے کو زیادہ اہم یا اصلاً مطلوب سمجھنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟(۲۵)

موجودہ سائنس کو اس کی مابعد الطبیعیات اور اس کے تصور علم سے ہٹا کر یہ سمجھنا کہ یہ ایک غیر اقداری اور فطری قسم کا علم ہے اور جس کا مقصد نوع انسانیت کی بھلائی ہے ایک نہایت غیر علمی اور خطرناک طرز تحقیق ہے۔خطرناک اس لیے کیوں کہ آج تک جن معاشروں میں بھی سائنسی علوم کو علمی برتری حاصل ہوئی وہاں مذہبی حقائق اور مذہبی معنویت زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم کی اٹھان حقیقت کے جن مابعد الطبیعیاتی تصورات پر ہوتی ہے وہ تصورات اس علم کے ساتھ ہی افراد اور معاشروں میں منتقل ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سائنسی علم کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی ذہنیت بھی افراد میں پروان چڑھتی ہے جس کا آخری اور لازمی نتیجہ وہی ہوتا ہے جو مغربی معاشروں میں ہمیں نظر آ رہا ہے۔ بیکن ، نیوٹن، ڈیکارٹ، ہیوم، کانٹ، ہیگل، مارکس وغیرہ سے لے کر ہزرل، پاپر، کاہن، فیئر بینڈ، ہیبر ماس تک کسی ایسے نامور فلسفی کا نام نہیں بتایا جاسکتا جس نے سائنس کا مقصد مذہب کی خدمت قرار دیا ہو۔ ان فلسفیوں اور ان کی تعلیمات کی حیثیت مغربی دنیا کی تشکیل میں ویسی ہی ہے جیسی مذہبی معاشروں کی تشکیل میں تعلیمات انبیاء کی ہوتی ہے(۲۶)۔سائنسی علم کی تشکیل(development) کو ان خیالات و نظریات سے ماوراء سمجھنا محض سادہ لوحی کی دلیل ہے۔

حامیان سائنس کی یہ بات درست ہے کہ اب تک کی سائنسی تحقیقات کسی نہ کسی درجے میں اسلامی حقائق کا اثبات کرتی ہیں نیز ان کے ذریعے کچھ لوگوں کو قبول اسلام کی توفیق بھی نصیب ہوئی ہے، لیکن ایسے چند واقعات سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ سائنس کو تبلیغ اسلام کا اصل الاصول بنالیں نیز یہ ایک نہایت عمدہ شے ہے؟ قبول اسلام کی کوئی ایک معین وجہ نہیں ہوتی، اگر آپ سو افراد سے ان کے قبول اسلام کی وجہ دریافت کریں تو آپ کو درجنوں مختلف وجوہات سننے کو ملیں گی جن میں سے چند ایک آپ کے نزدیک نہایت عجیب اور معمولی (trivial) نوعیت کی ہوں گی۔ حادثاتی طور پر کوئی بھی بات اور واقعہ انسان کی قلبی حالت بدل سکتا ہے، لیکن اس حادثاتی واقعہ کو کبھی تبلیغ کا عمومی طریقہ کار سمجھ کر نہیں اپنایا لیا جاتا۔ دیکھیے فرعون کے جادوگر حضرت موسی علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر بھانپ گئے کہ موسی علیہ السلام نے جو کیا وہ

ہرگز جادو نہیں کیونکہ وہ جادو کی حقیقت خوب سمجھتے تھے لہذا ایمان لے آئے، گویا جادو کا علم ہی ان کے لیے ذریعہ ایمان بن گیا۔ لیکن اس واقعے کے بعد حضرت موسی علیہ السلام نے جادو سکھا کر تبلیغ کرنے کو بطور پالیسی نہیں اپنایا کہ آپ نے ان جادوگروں کی زیرنگرانی جادو سکھانے کا کوئی کالج قائم کروالیا ہو جہاں بنی اسرائیلیوں کو جادو کی تعلیم دلوا کر بس انہیں اپنا معجزہ دکھا کر اپنی نبوت کا اقرار کروالیا۔ اسی طرح سائنس کے ذریعے کسی شخص کو قبول اسلام کی توفیق ہو جانا ایک حادثہ تو ہو سکتا ہے مگر اسے کسی اصول کے طور پر نہیں اپنایا جا سکتا۔ معرفت الٰہی بذریعہ سائنس اسلامی تاریخ و علمیت کیلئے کلیتاً اجنبی تصورات ہیں، ہماری علمیت میں معرفت الٰہی حاصل کرنے کا معتبر طریقہ تعلیمات انبیاء پر عمل کرنا ہے اور اسی مقصد کی خاطر صوفیاء کے ہاں ذکر و اذکار، مجاہدے و مراقبے وغیرہ کی منازل طے کرائی جاتی ہیں۔ سائنس کے ذریعے چند لوگوں کے قبول اسلام کو دلیل بنا کر اسے تبلیغ اسلام کا اہم ذریعہ سمجھنا تقریباً ویسا ہی ہے جیسا مسلم مفکرین کا ٹی وی کو ذریعہ تبلیغ گردانا(۲۷) جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ **اثمهما اكبر من نفعهما** (یعنی اس کا گناہ اور نقصان اس کے فائدے سے بہت زیادہ ہے)۔ تبلیغ اسلام کے ضمن میں سائنس کا کسی بھی درجے میں کردار ایک غیر شعوری نتیجہ (unintended by-product) ہے نہ کہ اس کی اصل مقصدیت کا اظہار۔ لامحدود انسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے جو وسیع تر مواقع سائنس پیدا کرتی ہے ان میں سے چند مواقع کو اسلام کے لیے استعمال کر لینے سے اس کی مابعد الطبیعیات بدل نہیں جاتی کیونکہ سرمایہ داری کے فریم ورک کے بغیر یہ مواقع پیدا ہونا ہی محال ہے۔ اس کی مثال ٹی وی سے سمجھی جا سکتی ہے جسے ظاہری مناسبت کی بناء پر لاؤڈ سپیکر پر قیاس کر لیا جاتا ہے کہ جو چاہے جیسے مرضی اسے استعمال کر لے۔ مگر ٹی وی ایک مکمل نظام ہے جسے اگر نفع خوری اور لذت پرستی کے فریم ورک سے الگ کر دیا جائے تو ایک دن نہیں چل سکتا۔ آخر اشتہارات کے بغیر کروڑوں روپے کی لاگت کہاں سے پوری ہوگی؟ اور ان اشتہارات کا مقصد کمپنیوں کے نفع میں اضافے کے لیے صارفانہ معاشرت و معیشت (consumer society) کے فروغ کے علاوہ اور کیا ہے؟ بالکل اسی طرح کوانٹم مکینکس کے محض ایک تجربے کے لیے کروڑوں نہیں بلکہ اربوں ڈالر کی ضرورت پڑتی ہے اور جس کے بعد بھی کامیابی یقینی نہیں ہوتی، سوال یہ ہے کہ یہ دولت کہاں سے آئے گی؟ آخر سرمائے میں اضافے کے اصل الاصول کی خدمت کیے بغیر سائنسی تحقیقات کیسے ممکن ہوں گی؟ تبلیغ اسلام کے لیے وقتی طور پر سائنسی دلائل کو بطور ایک حکمت عملی (strategy) اپنانے اور اسے معیار (ideal) و اصل مطلوب بنا لینے سے دو مختلف قسم رویے وجود پاتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جدیدیت پسند مسلم مفکرین سائنس کو بالکل اسی طرح idealize کرتے ہیں جیسے جمہوریت، معاشیات و بینکاری کو کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر یہ عامیانہ عذر بھی

پیش کیا جاتا ہے کہ کار یاٹی وی ایجاد کرنے والے شخص کا مقصد سرمائے میں اضافہ کرنا نہیں تھا، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر غالب علمیت اپنی معنویت (potential) کا اظہار مخفی طریقے سے کرنے کے قابل ہوتی ہے، اور علمیت کی طاقت یہی ہے کہ وہ خاموشی اور غیر شعوری طور پر افراد کی زندگیوں اور فیصلوں پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔

جدید ذہن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مذہب کو غالب علمیت کے پیرائے میں بیان کرنے کا سبق مسلمانوں کو عیسائیت کی شکست سے سیکھنا چاہیے۔ نشأۃ ثانیہ کی ابتداء میں جب مغرب میں یونانی و رومی فکر کا احیاء ہوا تو سینٹ آگسٹائن (Augustine) اور اکوائناس (Aquinas) جیسے عیسائی علماء نے عیسائی تعلیمات کی بھلائی اسی میں سمجھی کہ اسے یونانی فکر و تصورات کے تناظر میں بیان کیا جانا چاہیے۔ اس رویے کے نتیجے میں عیسائی دنیا میں Scholasticism کی تحریک برپا ہوگئی جس کا مقصد عیسائیت کو یونانی منطق و فلسفے کے مطابق ثابت کر دکھانا تھا۔ اس جنون میں یونانی فکر کا ہر تصور تاویلات کے ذریعے عیسائی تعلیمات کا حصہ بنا دیا گیا (انہیں میں سے ایک تصور زمین کے ساکن ہونے کا نظریہ بھی تھا جو ارسطو کی فکر سے مستعار ہے، بائبل نظریہ حرکت یا سکون زمین کے سلسلے میں کوئی تعلیم فراہم نہیں کرتی)۔ اکوائناس نے عیسوی دینیات کو ارسطو کے فلسفے پر اس طرح قائم کیا تھا کہ ارسطو عیسوی دینیات کا لازمی جز بن گیا تھا اور حال یہ تھا کہ ارسطو کا انکار گویا عیسائی دینیات کا انکار ہے۔ سولھویں صدی کے آخر میں یہی ہوا کہ جب جدیدی (modern) فکر نے یونانی فلسفے کی کمزوریوں کو واضح کرنا شروع کیا تو ساتھ ہی عیسائیت کی دنیا میں زلزلہ آ گیا۔ سترہویں صدی میں جب گلیلیو نے حرکت زمین وغیرہ کے قوانین دریافت کیے تو ان کی زد اصلاً عیسوی دین پر نہیں بلکہ ارسطو پر پڑتی تھی لیکن لوگوں کو یہی محسوس ہوا کہ ارسطو کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی عقلی بنیادیں بھی زمین بوس ہوگئیں اور لوگوں کا ایمان عیسائیت پر کمزور ہوتا چلا گیا۔ ابتداءً جو کام انتہائی نیک نیتی سے شروع کیا گیا تھا نتیجتاً عیسائیت کے زوال کا باعث بنا۔ دور حاضر کے مسلم مفکرین پورے خلوص کے ساتھ بعینہ وہی غلطی دہرا رہے جو عیسائی علماء نے کی کیونکہ سائنس حصول علم کا کوئی حتمی ذریعۂ علم ہے ہی نہیں۔ مسلم مفکرین آج جس نام نہاد سائنسی حقیقت کو بڑے فخر سے قرآن و حدیث سے ثابت کرتے ہیں فرض کریں کل اگر سائنس اپنا نظریہ تبدیل کر لے تو یقین مانیے سائنس کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچے گا البتہ لوگوں کا ایمان مذہب سے ضرور متزلزل ہوگا۔ ایسی کاوشوں کا انجام وہی ہوتا ہے جو مصری عالم علامہ طنطاوی کی تفسیر کا ہوا جو دس جلدوں میں شائع ہوئی مگر اپنی اشاعت کے محض دس سال کے عرصے کے اندر یہ تفسیر پرانی (out dated) ہوگئی اور نئی سائنسی معلومات کی روشنی میں اسے درست کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی (۲۸)۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ تبلیغ اسلام کا مقصد کافرانہ ذہنیت بدل کر اسلامی انفرادیت کو فروغ دینا ہے،

سائنس کو معیار بنا کر تبلیغ کرنے کا مطلب موجودہ مادہ پرست سائنسی ذہن کو بدلنے کے بجائے دین کو اس ذہن کے مطابق تبدیل کرنا ہے جیسا کہ اس جملے ہی سے واضح ہے کہ 'ہمیں اسلام کو موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے تا کہ یہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول ہو سکے'۔ عصر حاضر کے ذہن کو انبیاء کے طریقہ کار کے مطابق بدلنے، اس کی مابعد الطبیعیاتی سطح کو تبدیل کرنے، اس کے علم کو ایمان کی روشنی دینے کے بجائے جدید متکلمین نے اس ذہن کے کفر کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کا کام کیا جس کے نتیجے میں دین کا حلیہ بدل گیا اور عصر حاضر کا ذہن جہاں تھا وہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ کسی شخص کے سامنے سائنس پر اعتراض کیجیے وہ اس اعتراض کو تحمل سے سن کر اس پر غور کرنے کے بجائے فوراً آپ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دے گا، وجہ یہ ہے کہ عہد حاضر کا ذہن مابعد الطبیعیاتی سطح پر تبدیل ہو گیا ہے لہٰذا انبیاء کے طریقے کے مطابق اس ذہن کو تبدیل کیے بغیر اسلام اس کے دل کی دھڑکن نہیں بن سکتا۔ جدید متکلمین سمجھتے ہیں کہ مغرب کے لوگ اسلام کی عقلی، سائنسی اور منطقی توجیہہ میسر نہ ہونے کے باعث دین کے دائرے میں داخل ہونے سے ہچکچا رہے ہیں، جیسے ہی انہیں اسلام کی کلامی، عقلی، سائنسی یا منطقی دلیل مل جائے گی اسی لمحے پورا مغرب اسلام لے آئے گا۔ یہ تصور بہر حال ایک مفروضہ ہے کیونکہ اگر عقلی دلائل کی بنیاد پر تبدیلی آتی تو آج کا انسان بے شمار غلط کام ترک کر دیتا لیکن یہی انسان سگریٹ پیتا ہے جب کہ اس پر لکھا ہوا ہے کہ اس سے کینسر ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی عظیم اکثریت بے نمازی ہے باوجود اس کے کہ وہ نماز کی فرضیت و اہمیت کی قائل ہے۔ ہمارے جدید مفکرین عقل کی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی پر امید ہیں اسی لیے جدید فکر کے تتبع میں اس مفروضے کے ذریعے پورے وجود انسانی کو محض 'عقل' میں محدود کر دیتے ہیں یہاں تک کہ علم نفسیات (psychology) کی پیروی کرتے ہوئے انسانی جذبات کو بھی عقلی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی احساسات و جذبات عقل سے ماوراء (independent) اور ماقبل (transcendent) ذریعۂ علم ہیں، صوفیاء کی اصطلاح میں جب تک کسی شخص کا 'حال' درست نہ ہو جائے اس کی عقل درست فیصلے کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ جس شخص کا حال یہ ہو کہ وہ گناہوں کی غلاظت میں ڈوبا ہو، اس کا قلب حب دنیا اور حب مال کا اسیر ہو ایسے شخص کو عقلی دلیلیں دینا ہی عبث ہے، پہلے اس کا حال ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اس کی عقل کو خیر و شر کا درست معیار میسر آ جائے۔ عقل میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ خیر و شر کا ادراک کر سکے یا انسانی مقاصد کی کوئی ترتیب متعین کر سکے۔ انبیاء کرام اور صوفیاء کا طریقۂ تبلیغ مناظروں اور دلیلوں کی بجائے فرد کا حال ٹھیک کرنا ہے اور یہی کامیاب طریقہ ہے۔ انبیاء سب سے پہلے قلب اور ذہن کے حال کو بدلتے ہیں جس کے نتیجے میں انسان کی پوری زندگی، معاشرت اور سیاست و ریاست تک بدل جاتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عقلی دلیلوں سے کام نہیں لینا چاہیے، لیکن صرف عقلی دلیلوں ہی پر تکیہ کرنا

بذات خود اسلاف کے طریقۂ تبلیغ کے خلاف رویہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ 'جدید ذہن کے تقاضوں' کو بدلے بغیر اسے دین کا پیغام پہنچانے کی کوشش عبث ہے، انبیاء وقت کے تقاضے پورے کرنے نہیں آتے بلکہ نئے تقاضے پیدا کرتے ہیں۔ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فخر الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جن معاشروں میں مبعوث ہوئے وہاں 'وقت کا تقاضا' یہی تھا کہ شرک اور اس پر مبنی معاشرت کو فروغ دیا جائے، مگر نبی کبھی زمانے کے تقاضوں کے آگے نہیں جھکتے اور یہی اسوہ ان کے ورثاء کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

سائنس کو اسلام سے ہم آہنگ فرض کرتے ہوئے مسلم مفکرین ان تمام نقصانات سے سہو نظر کرتے ہیں جو سائنس کے جز و لازم ہیں اور جس کی وجہ سے وہ غیر شعوری طور پر سائنس کی تباہ کاریوں کو اسلامی جواز فراہم کرتے ہیں۔ اس اغماض کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جدید سائنسی ایجادات ہمارے سامنے آخری تیار شدہ حالت (finished form) میں آتی ہیں لہٰذا ہماری نظر صرف اس ایجاد کے ظاہر اور اس سے حاصل ہونے والے فوری فوائد پر ہوتی ہے، لیکن اس کے نقصانات اور اس کی تیاری کے مراحل جن سے فطرت، کائنات اور انسان کو جو نقصانات پہنچتے اور پہنچ چکے ہیں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہم بازار سے جدید سائنس کی ایجاد کردہ کوئی چیز خریدتے ہیں تو یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اس شئے کی تیاری کا پورا عمل فطری اور حلال ہوگا، یہ شئے بالکل اسی طرح بنی ہوگی جس طرح درخت کی شاخ پر ایک پتّہ اگتا ہے، لیکن دونوں طریقوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ درخت پر پھول اور پتے فطری طریقے سے وجود میں آتے ہیں، اس درخت کی فطری نشوونما اس کائنات کی وجودی ساخت (ontological structure) اور اصول فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اسی وجہ سے کائنات کے لیے نقصان دہ اور تباہ کن نہیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ایجادات نے جس طرح کائناتی قوتوں کا استحصال کیا ہے وہ کائنات کی وجودی ساخت سے مطابقت نہیں رکھتا، یعنی سائنسی عمل کے ذریعے سرمایہ دارانہ ترقی (growth) کا حصول ماحولیاتی نقطۂ نگاہ سے کائناتی قوتوں کا ناجائز استعمال کر کے ہی ممکن ہو سکا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان خود اوزون کی تہہ پھٹنے اور دیگر خطرنات ماحولیاتی تبدیلیوں کے خطرات سے دوچار ہو گیا ہے (یہیں سے یہ قلعی کھل جاتی ہے کہ سائنس کا مقصد حقیقت کی تلاش ہے، کیونکہ اگر واقعی اس کا مقصد حقیقت کی تخلیق نہیں بلکہ دریافت ہوتا تو اس کی ایجادات کائنات کی وجودی ساخت سے ہم آہنگ ہوتیں)۔ جدید سائنس و ٹیکنالوجی نے بحر و بر میں جو فساد برپا کر رکھا ہے اس پر ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس کا کوئی انفرادی فائدہ اس کی کلی افادیت کی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ اکثر و بیشتر تو سائنس و ٹیکنالوجی سے حاصل ہونے والا انفرادی فائدہ اجتماعی نقصان کی قیمت پر ہی ملتا ہے مثلاً کار بنانے اور صرف کرنے کے عمل پر غور کیجیے۔ یہ پورا عمل فطرت، کائنات اور اس کے حسن و جمال کو تبدیل کرنے، برباد کرنے اور زہر پھیلانے کا عمل ہے۔ ایک گاڑی کی تعمیر میں جو سیکڑوں اقسام کے کیمیائی مادے اور ہزاروں گیلن پانی استعمال ہوتا ہے یہ تمام زہریلا مواد کیا مریخ پر

پھینکا جاتا ہے یا حدود زمین کا حصہ بنتا ہے؟ اس کیمیائی زہر سے انسانوں، درختوں، زمین، پودوں، سمندروں، دریاؤں پر کیا اثرات ہو رہے ہیں؟ اگر یہ زیر زمین پھینکا جاتا ہے تو یہ زہر کس تک پہنچتا ہے؟ اگر یہ سمندروں میں بہایا جاتا ہے تو اسے کون کھاتا ہے؟ اگر یہ دریاؤں میں انڈیلا جاتا ہے تو اسے کون پیتا ہے؟ اگر اسے بہت اونچے درجہ حرارت پر پگھلا کر، ابال کر یا جلا کر ہوا، فضاء و خلاء میں بھیج دیا جاتا ہے تو اس میں سانس کون لیتا ہے؟ کیا اس گاڑی کے زہر سے دنیا کا کوئی ذی روح محفوظ ہے؟ کیمیائی مادے بحر و بر میں فساد برپا کر رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ درست ہے تو کیا زہر کو سہولت کے نام پر پھیلا دینا ترقی ہے؟ صرف اتنا ہی نہیں ان کارخانوں کے قیام کے لیے سود اور ارتکاز زر کو ممکن بنانے والے نظام زر (monetary system) کے بغیر اربوں روپے کی سرمایہ کاری فراہم کرنا ممکن ہی نہیں۔ پھر اگر گاڑی واقعی محض ضرورت ہی کے لیے بنائی گئی تھی تو اس کے بننے کے بعد یہ کام ختم ہو جانا چاہیے تھا، مگر یہ ہر روز نئی نئی گاڑیاں اور نئے نئے ماڈل کیوں بنائے جا رہے ہیں؟ یہ کون سی ضرورت ہے کہ اربوں کھربوں روپے عیاشی کے لیے وقف کر دیے گئے ہیں اور اربوں روپے کے اشتہارات اور سودی معیشت کے ذریعے پوری دنیا کو جدید سائنسی ایجادات سے متعارف کرایا جا رہا ہے؟ سوال یہ ہے کہ ضرورت اور احتیاج کی حدود شریعت اور اخلاقیات طے کریں گی یا کارخانہ دار، سرمایہ دار، ٹی وی کے اشتہارات اور آزاد منڈی کی معیشت؟ کیا آزاد منڈی اور اربوں روپے فراہم کرنے والے نظام زر کی موجودگی کے بغیر کار بنانے کا پورا عمل جاری و ساری رہ سکتا ہے؟ کیا عیاشی و فضول خرچی کے لیے ہر روز کاروں کے نئے ماڈل کی تیاری کے نام پر دنیا کے ہر حصے کو آلودہ اور تباہ و برباد کرنے کی اجازت شریعت کے منہاج میں دی جا سکتی ہے؟ کیا مذہب کار بنانے کے اس غیر فطری، تباہ کن اور مہلک طریقہ کار کی تصدیق، توثیق و تائید کر سکتا ہے؟ ان جیسے سوالوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ائیر کنڈیشن صرف کرنے کے عمل سے جس قسم کی زہریلی گیس آب و ہوا کا حصہ بنتی ہے اس کا اندازہ لگانا بھی ایک عام انسان کے لیے ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی ترقی سے کائنات کو پہنچنے والے ناقابل تلافی نقصانات کے بعد اب بذات خود مغرب میں بھی anti-growth (ترقی مخالف) مفکرین کا طبقہ ابھر کر سامنے آ رہا ہے[۲۹]۔ دور جدید میں 'انسانی سہولت' کے نام پر سامان استعمال کی تیاری نے اس دنیا کو انسانی استعمال کے لائق نہیں چھوڑا، چنانچہ یہ ثابت ہو چکا کہ غیر مضر طریقے سے اشیاء بنانے کے لیے جس پلوشن فری انڈسٹری (pollution free industry) کی ضرورت ہے وہ انسان کے بس سے باہر ہے۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا

تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام.. پتہ ....

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

استفسارات

ڈاکٹر محمد امین

کیا مغربی سائنس وٹیکنالوجی کے بغیر ترقی ممکن ہے؟

سوال: کیا مغربی علوم خصوصاً سائنس وٹیکنالوجی کے بغیر مسلم معاشرہ ترقی کرسکتا ہے؟

جواب: اس کا سادہ، واضح، مختصر اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کی پیروی کر کے ترقی نہیں کرسکتا لیکن دقت یہ ہے کہ آج کے جدید تعلیم یافتہ کسی آدمی کی سمجھ میں آسانی سے یہ بات نہیں آسکتی۔ یہ مسئلہ اتنا گمبھیر، الجھا ہوا اور ہشت پا یعنی متعدد پہلوؤں کا حامل ہے کہ ہمیں اس کی وضاحت کے لیے ۵۰۰ صفحات کی کتاب ''مسلم سرٔ ۃ ثانیہ: اساس اور لائحۂ عمل'' لکھنا پڑی تاہم اس کے باوجود ہم کوشش کریں گے کہ دو تین صفحات میں اس سوال کا مختصر اور عام فہم جواب دے سکیں:

۱۔ کسی بھی قوم کی ترقی کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عہد کی غالب اور بالادست تہذیب کی پیروی شروع کردے کیونکہ ہر تہذیب کا ترقی کا اپنا تصور ہوتا ہے اور زندگی گزارنے کے اپنے اصول ہوتے ہیں، جن پر عمل کر کے وہ ترقی کرتی ہے۔

۲۔ دنیا میں تہذیبوں کے دو بڑے گروپ ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی بالادستی میں یقین رکھتا ہے اس میں بنیادی اہمیت اللہ یعنی وحی الٰہی کو حاصل ہوتی ہے اور موجودہ زندگی کے بعد آخرت کی زندگی کا تصور ہوتا ہے اور اس کے ہاں کامیابی اور ترقی کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے تاکہ اسے دنیا میں بھی ترقی، قوت، غلبہ اور کامیابی ملے اور فرد آخرت کی زندگی میں بھی کامیاب ٹھہرے۔

دوسرا تہذیبی گروپ وہ ہے جو مذہب کی بجائے انسان کی خودمختاری اور سیادت پر یقین رکھتا ہے۔

اس طرح کی تہذیب میں صرف دنیا کی موجودہ زندگی کی کامیابی وترقی مقصود ہوتی ہے اور اس کا انحصار انسانی عقل وتجربہ پر ہوتا ہے۔

۳۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا اصول یہ ہے کہ وہ لوگوں کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا بلکہ اس نے انسانوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ مذکورہ بالا دونوں تہذیبوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔ وہ اس کے تصور ترقی کے مطابق ترقی کر سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس تہذیب کے اصولوں سے مخلص اور کمٹڈ ہوں اور ان پر دل وجان سے عمل کریں۔

اس اصول کی کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی جس تہذیب کے اصول وقواعد سے بھی وابستہ ہو جائے اس وابستگی کے نتیجے میں فرد کے اندر وہ بنیادی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو دنیا میں ترقی کرنے اور اکتساب رزق واسباب کے لیے درکار ہوتے ہیں جیسے محنت کی عادت، نظم وضبط، تنظیم اور منصوبہ بندی، قانون کی پیروی، اطاعت امیر، ایثار وقربانی، وغیرہ۔ فرق یہ ہے کہ پہلے تہذیبی گروپ کے اصول وقواعد پر حقیقی وابستگی اور عمل سے اس دنیا میں بھی ترقی ملتی ہے اور آخرت میں بھی کامیابی فرد کا مقدر ٹھہرتی ہے اور دوسرے تہذیبی گروپ کے اصول وقواعد پر عمل اور حقیقی وابستگی سے صرف اس دنیا کی زندگی میں ترقی اور کامیابی ملتی ہے جب کہ آخرت کی کامیابی پر نہ تو اس تہذیب کے لوگ یقین رکھتے ہیں اور نہ وہ انہیں ملتی ہے۔

ترقی اور کامیابی کے یہ دو اصول یکساں طور پر کارآمد ہیں لیکن اللہ نے بتا دیا ہے کہ اس کا پسندیدہ طریقہ اور راستہ وہ ہے جو پہلے گروپ کا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی ترقی چاہتے ہیں نہ کہ ان لوگوں کا جو صرف دنیا میں ترقی چاہتے ہیں۔

۴۔ جس طرح ان دونوں تہذیبی گروپوں کے ترقی کرنے کے منہاج میں اختلاف ہے اسی طرح ان کے زوال کے اسباب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پہلا گروپ اس وقت زوال پذیر ہوتا ہے جب وہ اپنے اصولوں پر عمل چھوڑ دے، کیونکہ اس کے اصول تو صحیح ہوتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ البتہ دوسرا گروپ چونکہ الٰہی ہدایت سے محروم ہوتا ہے اس لیے اس کے وضع کردہ قواعد میں سے بہت سے بالعموم ناقص اور غیر فطری ہوتے ہیں اور اکثر وبیشتر ان پر عمل کا نتیجہ فساد فی الارض کی صورت میں نکلتا ہے اور یوں یہ گروپ اپنی تباہی کو خود دعوت دیتا ہے۔

۵۔ چونکہ ان تہذیبی گروپوں کے ترقی کرنے کے تصورات ایک اور زندگی گزارنے کے اصول و قواعد ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہوتے ہیں لہٰذا ایک گروپ دوسرے گروپ کی پیروی کر کے ترقی نہیں کر سکتا۔ دونوں صرف اپنے اپنے اصولوں پر عمل کر کے ترقی کر سکتے ہیں۔ ایک گروپ اگر زوال

پذیر ہو اور وہ ترقی اور کامیابی کے لیے دوسرے ترقی یافتہ گروپ کی پیروی شروع کر دے تو وہ زوال میں مزید دھنستا چلا جائے گا کیونکہ دونوں تہذیبی گروپوں کے زندگی گزارنے کے اصول اور تصورات ترقی ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔

۶۔ خلاصہ یہ کہ مسلمان معاشرے اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلامی اصولوں سے عملاً وابستہ ہو جائیں جیسا کہ وابستگی کا حق ہے یعنی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاریں تو ان میں بھی اکتساب رزق و اسباب کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور وہ دنیا میں بھی ترقی کریں گے اور اس کے افراد آخرت میں بھی کامیاب ٹھہریں گے اور اگر وہ اپنے مخالف تہذیبی گروپ (مثلاً مغربی تہذیب یا ہندو تہذیب) کی پیروی کی کوشش کریں گے تو زوال میں مزید دھنستے چلے جائیں گے کیونکہ اس تہذیبی گروپ کے زندگی گزارنے کے اصول اور تصورات ترقی ان کے زندگی گزارنے کے اصولوں اور تصوراتِ ترقی سے مختلف اور متضاد ہیں۔ مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کی مجبوری ہے کہ انہیں اسلام پر عمل کرنا پڑے گا اور اچھا مسلمان بننا پڑے گا اور غیر اسلام (خصوصاً مغربی تہذیب) کو چھوڑنا پڑے گا ورنہ وہ ترقی نہ کر سکیں گے۔

۷۔ مسلمان اس لیے زوال پذیر ہو گئے کہ انہوں نے اسلام کے اصولوں پر عمل چھوڑ دیا تھا (جس کا ایک بنیادی مظہر اور سبب ان کے نظام تعلیم و تربیت کا ناقص ہو جانا تھا جس نے یکسو، متحرک اور مستحکم مسلم شخصیت کی تیاری کا کام بند کر دیا تھا) جس کے نتیجے میں وہ کمزور ہو گئے اور مخالف طاقتور تہذیبی گروپ نے اسے دبا لیا اور مسلمانوں کو غلام بنا لیا۔ اس نے مسلمانوں کی جمع کردہ ایک ہزار سالہ ثروت کو خوب لوٹا، قوت سے انہیں کچلا اور آئندہ لمبے عرصے تک غلام رکھنے کے لیے دیگر کاموں کے علاوہ ایک بنیادی کام یہ کیا کہ ان کے نظام تعلیم و تربیت کو ختم کر کے اپنا نظام تعلیم و تربیت ان کے معاشرے میں (مقامی رنگ اور اصولوں کے ساتھ) نافذ کر دیا۔ اس میں بھی وہ کامیاب رہا۔

آج مسلمان زوال سے نکلنے اور ترقی کرنے میں اس لیے کامیاب نہیں ہو پا رہے کہ ان کے معاشرے کے پڑھے لکھے اور موثر و مقتدر طبقات کی اکثریت مغربی تہذیب کی فکری اور ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو پا رہی اور اس کا ایک بنیادی سبب استعمار کا قائم کردہ وہ نظام تعلیم و تربیت ہے جو اس ذہنی غلامی کی فضا کو جاری رکھے ہوئے ہے (انگلش میڈیم، اے اور اے لیول، مخلوط تعلیم، آکسفورڈ کی کتابیں، پینٹ اور نکٹائی...... وغیرہ اسی کا مظہر ہیں)۔

امید ہے ہمارا یہ نقطۂ نظر آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز اپنے نظریۂ حیات (اسلام) پر مخلصانہ عمل میں ہے نہ کہ مغربی تہذیب اور اس کے علوم اور طرزِ زندگی کی پیروی میں۔

مکاتیب

بزم قارئین

محمد ارشاد مغل ایڈووکیٹ (اٹک) **موضوع:** جماعت اسلامی و تبلیغی جماعت

جنوری کے شمارے میں آپ نے جماعت اسلامی کو جو مشورہ دیا ہے وہ خود مولانا مودودی نے ابتدائی اصلاحی کام شروع کرتے وقت اختیار کیا تھا، جو دو مرحلوں میں تھا۔ پہلا مرحلہ انہوں نے اپنی زندگی میں شروع کیا تھا اور دوسرا مرحلہ جو آپ نے ان کو مشورۃً اب جنوری کے شمارہ میں دیا ہے۔ انہوں نے اس پر کافی عرصہ سے عمل شروع کیا ہوا ہے۔ راقم جماعت کے ان تبلیغی دوروں میں شریک رہا ہے اور انہوں نے سہ روزہ بالکل تبلیغی جماعت کی طرح شروع کر رکھا ہے اور چونکہ یہ پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ ہیں لہٰذا ان کے طریق کار میں علمی سرگرمیاں بخوبی موجود ہیں لہٰذا آپ خوش ہو جایئے کہ آپ کے مشورہ دینے سے پہلے ہی وہ اس مشورہ پر عمل پیرا ہیں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔

فروری کے البرہان میں آپ نے رائے ونڈ والی تبلیغی جماعت کو کچھ مشورے دیے ہیں۔ چونکہ میں اس جماعت میں بھی شامل ہوں اور آئندہ رائے ونڈ میں جو چار ماہ والوں کا اجتماع ہے اس میں بھی شریک ہونے جا رہا ہوں، اس لیے ان کو جو آپ نے مشورے دیئے ہیں ان کی طرف سے جواب حاضر ہے۔ رائے ونڈ کے تبلیغی ساتھیوں سے میں نے سنا ہے کہ ہمارے بڑے اب کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ اب کافی زیادہ ساتھی ہو چکے ہیں اور اب مرحلہ ان کی تعمیر سیرت کا ہمارے سامنے ہے تا کہ معاملات میں یہ لوگ اچھے اور پورے اترنے کے قابل ہو سکیں۔ اس لحاظ سے آپ کے مشورے پر تبلیغی جماعت والے پہلے سے ہی عمل پیرا ہیں اور یہ بھی آپ کے لیے خوشی اور مبارک کی بات ہے۔

اب میری گزارش آپ سے یہ ہے کہ مہربانی فرما کر آپ ہر دینی جماعت کی، چاہے وہ علمی و

تحریری کام ہو یا تبلیغ کا، درس گاہ ہو یا خانقاہ، آپ اس حد تک اس کی مدح سرائی فرمائیں جس حد تک وہ دینی کام میں مصروف عمل ہے اور جو کوتاہی کسی بھی حلقۂ فکر میں پائی جاتی ہے اور آپ کو نظر آتی ہے اس سے آپ صرف نظر فرمایئے تا کہ کوئی حلقۂ فکر آپ سے بدظن نہ ہو اور آپ کے لیے خیر سگالی کے جذبات ان کے دل و نگاہ میں بھرپور طور پر قائم و دائم رہیں۔ یہ میں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ کوئی جماعت یہ نہ کہے کہ تنقید کا حق آپ کو کس نے دیا ہے اور وہ آپ سے بدظن نہ ہو جائیں اور آپ کی منزل کھوٹی نہ ہو۔ یہ بھی ایک مشورہ ہے قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کا حق ہے۔

البرہان

ہمیں تسلیم ہے کہ مغل صاحب کا خط ہمارے لیے دو نئی خبریں لایا ہے اور ان سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی میں بھرپور دعوتی اور اصلاحی کام شروع ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ تبلیغی جماعت میں اپنے کارکنوں کی جامع تربیت کا احساس روز افزوں ہے۔ اللہ کرے یہ حقیقت ہو اور اس میں اضافہ ہو۔

مغل صاحب یقین خاطر رکھیں کہ دینی جماعتوں پر تنقید و تنقیص ہرگز ہمارے پیش نظر نہیں۔ ہمیں ان سے محبت ہے، ہم ان کے خیر خواہ اور حمایتی ہیں اور انہیں کامیاب و کامران دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی جذبۂ خیر خواہی، برادرانہ اخوت اور الدین النصیحہ کے فرمان نبوی کے تحت بعض اوقات انہیں کام کو بہتر بنانے کے لیے مشورے دینے لگتے ہیں ورنہ ان کی عزت و اکرام اور عظمت کے ہم قائل ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔

آفتاب عروج (چنیوٹ)　　　　**موضوع:** جاوید غامدی صاحب کی فکر

آفتاب عروج صاحب نے البرہان کے شمارہ اکتوبر ۲۰۱۱ء کے مضامین پر، جس میں ہم نے جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر کا محاکمہ کیا تھا، ایک طویل تبصرہ کیا ہے (البرہان کے تقریباً ۲۰ صفحات)۔ وہ ’اہل قرآن جیسی فکر کے حامل ہیں اور غامدی صاحب کے موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم موصوف کا تفصیلی موقف پیش کرنے اور پھر اس کا مفصل جواب دینے کی سکت نہیں رکھتے۔ ان کی بعض آراء درج ذیل ہیں:

پاکستانی عوام کے دباؤ پر ان کی پارلیمنٹ کا توہین رسالت کے خلاف موت کی سزا کا قانون پاس کرنا خلاف قرآن ہے۔ عورت کی دیت آدھی قرار دینا اور عورت کو نکاح باندھنے کا حق نہ دینا قرون وسطی کی دقیانوسی سوچ ہے جو خلاف قرآن ہے۔ داڑھی رکھنا دین (کے معاشرتی نظام) کا تقاضا نہیں ہے اور نہ آخرت میں اس کی باز پرس ہوگی۔ یہ کہنا کہ جو معاشرہ نبی ﷺ نے قائم کیا تھا وہ بلا انقطاع قائم چلا آ رہا ہے محض خوش فہمی اور مبنی بر تضاد دعویٰ ہے۔ ’حساس علماء حق‘ عرصہ سے احادیث کی تدوین نو کا کام کرنا چاہ

رہے تھے لیکن کفر کے فتووں کے خوف سے ایسا نہیں کر پا رہے تھے۔ اب یہ کارنامہ حکومت ترکی انجام دے رہی ہے تو اس پر خوش ہونا چاہیے۔ غامدی صاحب صحیح کہتے ہیں کہ نئی فقہ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کے اپنے کرتوت ہیں نہ کہ مغرب کی سازشیں۔ فقہ حشو زوائد اور غیر یقینی ہے صرف قرآن پر عمل ہونا چاہیے۔ علماء اور فرقے مسلمان کی تعریف پر متحد نہیں۔ فقہ واریت خلاف قرآن ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک رکن جماعت اسلامی (راولپنڈی)

جماعت پر آپ کے مضامین ۹۰ فیصد جماعتیوں کے دل کی آواز ہیں (SMS)

البرہان

کہ خوشی سے مر نہ جائے اگر اعتبار ہوتا

سردار عالم خاں صاحب (لاہور) **موضوع:** اسلام اور مغربی جمہوریت

سردار عالم خاں صاحب نے جنوری ۲۰۱۲ء کے البرہان پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ اس شمارے میں ہمارا ایک مضمون مغربی جمہوریت کے ساتھ مفاہمت کے رویے کے حوالے سے مغرب کی ملحدانہ جمہوریت کو اسلامی جمہوریت میں بدلنے کے نتائج سے متعلق تھا۔ اس بارے میں ہم نے عرض کیا تھا کہ اس کے نتیجے میں ملک میں اسلام نافذ ہونے کی بجائے مغرب کی اسلام مخالف تہذیب کو غالب آنے کا موقع ملا ہے لہٰذا علماء کرام کو اپنے اس اجتہاد پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

سردار عالم خاں صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دینی سیاسی جماعتوں کے موقف کی تصویب کرتے ہوئے ہمارے موقف پر متعدد اعتراضات وارد کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''مغربی جمہوریت میں اسلام کی جس پیوند کاری کی ڈاکٹر صاحب نے بات کی ہے اس بارے میں ان کا ذہن یکسو نظر نہیں آتا۔

اپنے مضمون کی ابتداء میں وہ فرماتے ہیں کہ دینی عناصر نے اجتماعی امور اور سیاسی حالات سے عملاً الگ تھلگ رہنے 'اور' مغرب کے سیاسی اداروں کو بعینہ قبول' کرنے کے درمیان بیچ کا معتدل راستہ یہ نکالا تھا کہ مغرب کے سیاسی نظام (جمہوریت) میں اسلامی حوالے سے کچھ 'بنیادی' تبدیلیاں کرالی جائیں اور پھر اس کی مزید اصلاح اور اسے اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ بعد میں وہ ان تبدیلیوں کا ذکر تو نہیں فرماتے نہ یہ بتاتے ہیں کہ مزید اصلاح کا کام کہاں تک ہوا اور کیا وہ رک گیا ہے' بلکہ اب وہ ان تبدیلیوں کو ہی 'بنیادی' کی بجائے 'سطحی' اور 'برائے نام' (تفصیل بتائے بغیر) کہہ کر پاکستان کی تقریباً تمام خرابیوں کی ذمہ داری ان دینی عناصر پر ڈال دیتے ہیں

جنہوں نے اس 'معتدل راستہ' کو 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر عملی سیاسی جدوجہد ہی شروع نہیں کر دی بلکہ اسے 'اقامتِ دین' 'اسلامی انقلاب' 'نظامِ مصطفیٰ' اور 'نفاذِ شریعت' جیسے خوبصورت نام دے کر شاید دوسروں کے علاوہ خود کو بھی دھوکہ دینا شروع کر دیا۔ (اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کس کس نے استعمال کی ہے اگر ڈاکٹر صاحب اس کی نشاندہی فرما دیتے تو بہتر تھا' دینی حلقوں میں تو مروجہ سیاسی نظام میں 'مزید اصلاح' کی گنجائش ہمیشہ باقی رہی ہے اور اب بھی ہے)۔ ان کا یہ فرمانا بھی واقعاتی طور پر درست نہیں لگتا کہ مغرب نے مسلمان ملکوں میں اس 'اسلامی جمہوریت' کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔ حقیقی صورت حال تو شاید اس کے بالکل برعکس ہے۔ اِن کے اس موقف میں بھی تضاد ہے کہ اس اسلامی جمہوریت میں دینی عناصر برسر اقتدار نہیں آسکتے۔ وہ خود پاکستان میں ایم ایم اے کے دو صوبوں میں حکومت بنانے اور عرب ممالک میں اسلامی جماعتوں کے کامیاب ہونے کا ذکر فرما رہے ہیں۔ انہوں نے مغربی جمہوریت کے چار بنیادی تصورات کا ذکر کرتے ہوئے ووٹ کی مساوات کو بھی غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ تو کیا ہر مسلمان زمین پر اللہ کا یکساں خلیفہ نہیں ہے۔ کیا مسلمانوں کے سیاسی نظام میں 'بیعت عامہ' کا تصور وہ خود تسلیم نہیں فرما رہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقبال کے شعر کا حوالہ دیا ہے کہ جمہوریت میں 'بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے' اگر اقبال ہی سند ٹھہرے تو اسے کیا کہیں گے کہ موصوف خود پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑ چکے ہیں۔ اس بارے میں وہ یہ تاثر دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام کے سیاسی نظام میں صرف اصحاب الرائے سے مشاورت کا تصور ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صرف اکابر صحابہ سے رائے لیتے تھے۔ (پر اب اکابر صحابہ کہاں سے آئیں گے اور آج اکابرین کا تعین کون کرے گا اور کیسے؟ کیا دیوبندی اور بریلوی صاحبان کے اکابرین مشترک ہیں؟ خلفائے راشدین کے انتخاب کا حتمی فیصلہ تو اسی وقت ہوا تھا جب عام لوگوں نے بیعت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے کہ حضرت علیؓ کا اصرار تھا کہ وہ اصحابِ بدر کے کہنے پر خلافت قبول کریں گے مگر آج کے دور میں اصحاب بدر کی جگہ کون لے گا؟ ڈاکٹر صاحب نے مغربی جمہوریت کے بعض نقائص پر بالکل جائز تنقید کی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں انتخاب کا متبادل کیا ہو؟ اسے بالکل تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ کہہ دینے سے تو بات نہیں بنتی کہ امت کے اہل حل وعقد کو تقویٰ اور صلاحیت کی بنیاد پر خلیفہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ یہ سوال تو باقی رہا کہ آج کے اہل حل وعقد کون ہیں اور اگر انہوں نے ووٹوں سے منتخب نہیں ہونا تو انہیں نامزد کون کرے گا۔ تقویٰ اور صلاحیت کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہوگا؟ ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ ہم نے انتخابی سیاست کو اپنا کر مغرب کی سیکولر جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کر لیا ہے حقیقت پر مبنی نظر نہیں آتا۔ تاہم اگر انہیں اسی پر اصرار ہے تو وہ پھر موجودہ طریقہ انتخاب کا کوئی متبادل تو تجویز فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ موقف جزوی طور پر صحیح ہے کہ مغرب نے مسلمان ممالک میں اپنے آلہ کار حکمرانوں اور اداروں کے ذریعہ اسلام پسند سیاسی قوتوں کی کامیابی میں مقدور بھر رکاوٹیں ڈالیں۔ (ایسی

صورت میں ان کی ناکامی کو محض ان کی حکمت عملی کی کمزوری نہیں سمجھ لینا چاہئے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے مضامین زیر بحث ظاہر کرتے ہیں) اور اگر وہ کہیں جیت گئیں تو انہیں اقتدار میں آنے نہیں دیا گیا اور اگر وہ کسی طرح اقتدار میں آ گئیں تو وہ اچھی کارکردگی نہ دکھا سکیں۔ مغرب اور ان کے گماشتوں کی ذمہ داری صرف جزوی ہے۔ اصل قصور وار تو اسلام پسند قوتیں ہیں یا ان کے وہ نقاد جو خود ساحل سے تماشا دیکھتے ہیں پاکستان کی حد تک اسلام پسند قوتیں ہمہ وقت باہم دست و گریبان رہتی ہیں۔ ایم ایم اے کی مثال سامنے ہے۔ ان قوتوں نے مل کر الیکشن لڑا تو کامیابی کی صورت نکل آئی کہ ان کے ووٹ آپس میں تقسیم نہیں ہوئے۔ اگر وہ اچھی کارکردگی دکھاتیں تو آئندہ بھی بہتری کی توقع کر سکتی تھیں۔ اس ضمن میں اسلام پسند دانشور بھی بے قصور نہیں جو کسی جماعتی نظم کے پابند ہونے کی بجائے آزادانہ کام کو ترجیح دیتے ہیں تا کہ وہ خیالی تجاویز کی پتنگیں اڑاتے رہیں۔

البرہان

ہم مختصراً عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ ہم نے اپنے مضمون میں مغربی جمہوریت کے مقابلے میں اسلام کے سیاسی نظام کا کوئی تفصیلی، متبادل اور عصر حاضر میں قابل عمل نقشہ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ یہ ایک علیحدہ مستقل اور طویل موضوع ہے۔ ہم نے تو صرف یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ مغرب کے سیاسی نظام کی فکری بنیادیں اسلام مخالف ہیں لہٰذا ان کے سیاسی نظام کو معمولی اسلامی کتر بیونت کے بعد، قبول کر لینے کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیب غالب آئی ہے اور اسلام پسپا ہوا ہے۔

۲۔ کیا سردار صاحب دو باتوں میں فرق محسوس نہیں کرتے؟

ایک: یہ کہ اسلام ایک مکمل دین اور تہذیب ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کچھ بنیادی سیاسی اصول دیئے ہیں اور انہیں (یعنی ان کے اہل علم اور مجتہدین کو) یہ اجازت دی ہے کہ وہ اسلامی اصولوں، شرعی مقاصد اور اپنی ضرورتوں اور حالات کے مطابق ایک سیاسی نظام تشکیل دے لیں۔ اگر مسلمان اہل علم ایسا کرتے ہوئے اپنے زمانے کے غیر مسلم معاشرے میں مروج سیاسی اداروں اور روایات سے کچھ محدود و محتاط استفادہ کر لیں ۔ ایسا استفادہ جو اسلامی اصولوں اور شرعی مقاصد کے خلاف نہ ہو یا انہیں اپنی ضرورت و مزاج کے مطابق Tailor کر لینے کے بعد ہو تو یہ جائز ہے۔

دوسرے: ایک ایسی تہذیب جس کی بنیادی فکر خدا، رسول اور آخرت کے انکار پر مبنی ہو اور جو انسان کو اللہ کے مقابلے میں مختار مطلق قرار دیتی ہو اور یہ ان قوموں کی تہذیب ہو جن کے بارے میں قرآن کا حتمی فیصلہ موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کی دشمن اور بدخواہ ہیں اور عملاً ان کی اسلام اور مسلم دشمنی اظہر من

الشّمس ہواوران کا ایک سیاسی نظام ہو جوان کی فکر کا عکاس ہواور مسلمان اس غالب تہذیب سے مرعوب و متاثر ہوکران کے سیاسی نظام کو اپنا لیں اوراس میں اشک شوئی کی خاطر کچھ تھوڑی بہت اسلامی باتیں داخل کرلیں۔

ہم پہلی صورت کی تصویب کرتے ہیں اور دوسری کو ردّ کرتے ہیں اوراسی کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

۳۔سردار صاحب موصوف نے اپنی تحریر میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ 'ہر مسلمان زمین پر اللہ کا یکساں خلیفہ ہوتا ہے'۔ ہم سردار صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں عربی زبان،قرآن حکیم اوراسلام کے سیاسی نظام کے مطالعے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔

موضوع: جماعت اسلامی کے لیے بعض تجاویز

سردار صاحب نے اپنے تبصرے میں جماعت کی مروجہ فکر یعنی اسلامی تبدیلی بذریعہ سیاسی جدوجہد کی حمایت کی ہےاور ہماری دی جانے والی متبادل تجاویز یعنی اسلامی تبدیلی بذریعہ اصلاح معاشرہ یا سماجی تبدیلی کو ناقابل عمل قرار دیا ہے البتہ سیاسی کامیابی کے لیے انہوں نے جماعت کو کئی مشورے دیے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کے سامنے حکمت عملی کی تبدیلی کی جو تجویز رکھی ہے وہ بھی ناقابل فہم ہے۔ ان کا فرمانا ہے کہ جماعت کو اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد کو چھوڑ کر اسلامی انقلاب بذریعہ اصلاح معاشرہ کی متبادل حکمت عملی کی طرف لوٹ جانا چاہئے۔ یا کم ازکم تقسیم کار کا اصول اپناتے ہوئے جماعت اس پر ہی راضی ہو جائے کہ تبدیلی بذریعہ سیاسی جدوجہد پر قائم رہتے ہوئے تبدیلی بذریعہ اصلاح معاشرہ کو بھی اپنا ہدف قرار دے لےاوراپنے ارکان اور کارکنوں کو اصلاح معاشرہ کے لئے اپنے آپ کو منظم کرنے کی اجازت دے دے بلکہ خودان کی تنظیم سازی کرے۔اس تجویز سے یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں 'سیاسی جدوجہد' فرد کا تزکیہ ''اصلاح معاشرہ' او'خدمت خلق' متوازی بلکہ متبادل دائرے ہیں اور کوئی نظریاتی جماعت ان دائروں میں سے کسی ایک دائرے ہی میں کام کرسکتی ہے۔اگر وہ بیک وقت ایک سے زیادہ دائروں میں کام کرنا چاہے تو اول تو اس سے اجتناب ہی کرنا بہتر ہے ورنہ کم ازکم ہر دائرے کے لئے علیحدہ تنظیم قائم کرنی چاہیے۔

بادی النظر میں جماعت اسلامی کا کم ازکم اعلان کردہ موقف یہ ہے کہ ہر نظریاتی جماعت کے لئے ان تمام دائروں میں بیک وقت کام کرنا لازمی ہے۔ کوئی بھی جماعت جو پرامن انقلاب/تبدیلی کی داعی ہو معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ افراد کو اپنا ہم خیال بنانا چاہے گی جس کے لئے وہ اس معاشرہ کے افراد میں انفرادی طور پر دعوت اور تبلیغ وتربیت کا کام بھی کرے گی اور خلق کی خدمت بھی اس کا ایک ہدف ہوگا اور ان کوششوں کے ذریعہ اس کی سیاسی جدوجہد آگے بڑھے گی۔اس سیاسی جدوجہد میں دار ورسن کے مرحلے

آئیں گے جن سے اس کے کارکنوں کا تزکیہ اوران کی اخلاقی تربیت بھی ہو سکے گی۔ پھر سیاسی جدوجہد کی صورت میں جس قدر ریاستی اداروں تک رسائی ہو پائے گی اس حد تک ان اداروں کے ذریعہ فرد اور معاشرہ کی اصلاح اور خدمت خلق کا کام آگے بڑھایا جائے گا۔ یہ کام سیکولر سوشلسٹ/کمیونسٹ پارٹی بھی پاکستان میں کرتی رہی ہے اوراس ذہن کے لوگ اب بھی مختلف ناموں سے کر رہے ہیں۔عرب دنیا میں اخوان المسلمون اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔یہی حکمت عملی جماعت اسلامی نے اپنائی ہوئی ہے۔اس کی ناکامی یہ نہیں ہے کہ اب تک وہ پاکستان میں برسر اقتدار نہیں آئی۔اس کی ناکامی یہ ہے کہ پاکستان کی بہت بڑی اکثریت اس کی دعوت، تبلیغ وتربیت، اصلاح معاشرہ اور خدمت خلق کے پروگراموں کے باوجود اس کی ہم خیال نہیں بن سکی۔اس کی وجہ اس کے کارکنوں میں نظریاتی اخلاص اور ایثار وقربانی کی کمی ہوسکتی ہے۔اس کے مخالفین کی بہتر کارکردگی ہوسکتی ہے۔اس کی وجہ تاریخی عوامل بھی ہوسکتے ہیں (برصغیر کا پاپولر (عوامی) اسلام جو کسی حد تک صوفیاء کی دین ہے جماعت اسلامی کے 'خالص' اسلام سے ہم آہنگ ہوتا نظر نہیں آتا) حکومت وقت کی پالیسیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ جماعت اسلامی کی حد تک تو اس کی ایک بڑی اضافی وجہ اسلام ہی کے نام پر کام کرنے والوں کی شدید مخالفت رہی ہے۔ڈاکٹر صاحب بھی مولانا مودودی کی فکر کے امتیازی پہلو یعنی اقامت دین کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں بھولے کہ روایتی علماء ان کے مخالف تھے۔اس اختلاف کو وہ یہ کہہ کر کہ غیر اہم قرار دے رہے ہیں کہ یہ اختلاف ان دلائل کی تفصیلات میں تھا جس سے انہوں نے اپنے نظریات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسی بات نہیں ہے۔ان علماء نے جنہیں خاصا بڑا 'دینی طبقہ' اپنے اسلاف کا نمونہ سمجھتا ہے مولانا مودودی کو گمراہ ہی قرار نہیں دیا بلکہ انہیں 'مردود' اور 'خبیث' کے القابات تک سے نوازا ہے۔ان انتہائی متقی اور پرہیز گار عالمان دین اور صوفیائے عظام کے کچھ پیروکاروں کے نزدیک تو وہ سو یہودیوں کے برابر ٹھہرتے ہیں۔ اس بارے میں صرف دیوبندی مسلک کے علمائے کرام کی ستم ظریفیوں کی تفصیل کوئی جاننا چاہے تو عامر عثمانی مرحوم کی زیرادارت دیوبند کے ماہوار رسالے 'تجلی' کے چند شماروں کا مطالعہ ہی کافی ہوگا۔ ایسی صورت میں جماعت کو جو تھوڑی بہت پذیرائی ملی وہ بھی ایک معجزہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب جس متبادل حکمت عملی کی دعوت دے رہے ہیں اس کے حوالہ سے ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ وہ خود اس کی ابتدا کیوں نہیں کرتے؟ ڈاکٹر اسرار مرحوم بھی Passive Resistance کے اپنے 'انقلابی' منہاج پر اپنی جماعت سے تو خاطر خواہ عمل نہیں کرا سکے پر جماعت اسلامی کو تاحیات اس کی دعوت دیتے رہے۔جن محلہ وار کمیٹیوں کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب اصلاحِ اخلاق' سماجی تبدیلی' اصلاحِ معاشرہ' قیام امن اور خدمتِ خلق بلکہ نفاذِ شریعت کی امید لگائے بیٹھے ہیں وہ دو چار ایسی کمیٹیاں صرف شہر لاہور میں ہی قائم کر کے نتائج دیکھ لیں۔ یہ سلطنت کے اندر سلطنت کا یقیناً ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔ نعیم صدیقی مرحوم نے 'محسن انسانیت' میں یہ دعوی کیا ہے:

"تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں کہ فاسد قیادت کے زیر سایہ کوئی نظامِ فلاح پنپ سکا ہو۔اور بغیر سیاسی کشمکش کے محض وعظ وتبلیغ اور انفرادی اصلاح کے کام سے اجتماعی انقلاب نمودار ہو گیا

ہو، ورنہ گذشتہ ۱۳ صدیوں میں خلافت راشدہ کے بعد وعظ و ارشاد، تبلیغ و تذکیر، تعلیم و تزکیہ کے عنوان سے عظیم الشان مساعی، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے ادارات کے تحت عمل میں آتی رہی ہیں۔۔۔۔لیکن اس کے باوجود نہ اس حد مطلوب تک افراد کا تزکیہ ہوسکا ہے اور نہ معاشرہ کی اتنی اصلاح ہوسکی ہے جس کے نتیجہ میں اجتماعی نظام بدل جائے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انقلاب دوبارہ رونما ہوسکے"

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اگر جماعت نے کوئی چینل کھول لیا تو معاشرہ کی اصلاح میں بڑی مدد ملے گی۔اول تو جماعت 'ڈاکٹر ذاکر کے پیس (Peace) چینل سے بہتر چینل مشکل ہی کھول پائے گی۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایسے دوسرے چینلز کی موجودگی میں جہاں مزیدار فلمیں چٹ پٹے ڈرامے اور دلکش موسیقی دکھائی جارہی ہو اس چینل کو دیکھے گا کون؟ ڈاکٹر صاحب جماعت کو ایک اسلامی بینک کھولنے کا مشورہ بھی دے رہے ہیں حالانکہ ایسی بینکاری کو وہ اسلامی جمہوریت کی طرح مولانا تقی عثمانی اور پروفیسر خورشید کا ناکام اجتہاد' قرار دے چکے ہیں۔کیا ایسے چند بینکوں سے سودی نظام ختم ہوگیا ہے یا ہونے کی توقع ہے۔سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ریاستی پالیسی کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑے بغیر نہ ٹی وی چینل سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسلامی بینک کے اجرا سے بلاسود معیشت کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے نہ اسلامی نظام تعلیم کے نافذ ہونے کی کوئی امید کی جاسکتی ہے''۔

''ہماری ناقص رائے میں اصل مسئلہ شاید جماعت اسلامی کی حکمت عملی کی کمزوری کا اتنا نہیں ہے جتنا جماعت کے کارکنان کے کردار کی تنزلی کا ہے۔ان میں ایثار و قربانی کا وہ جذبہ کم ہوگیا ہے جو ان کے سابقون اولون کا امتیاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈیرہ غازی خاں سے جماعت کے ایک سابقہ ممبر قومی اسمبلی ڈاکٹر نذیر شہید کا ذکر کیا ہے اور الیکشن میں ان کی کامیابی کی وجہ ان کی خدمت خلق کو قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر شہید یقینا بطور ہومیو پیتھ لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ لیکن ان کی مقبولیت کا بنیادی سبب ان کا وہ سیاسی کام تھا جس کے تحت وہ ہر مظلوم کے حق میں آواز اٹھاتے اور ظالم کے خلاف سینہ سپر ہوجانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ان کے خلاف درجنوں مقدمات درج تھے اور وہ متعدد بار حوالہ زنداں ہوچکے تھے جہاں سے لکھے گئے ان کے خطوط چھپ چکے ہیں ان کی مشہور تقریر جس کو ہو جان و دل عزیز یہیں سے لوٹ جائے' بھی مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے۔ڈاکٹر نذیر شہید اپنی ساری تحریکی زندگی میں حق و باطل کی اس طویل و جانگسل کشمکش سے گزر کر کندن بن گئے تھے جسے مولانا مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدمہ' میں سلوک قرآنی' کہا ہے اور جو ان کے خیال میں فرد کے تزکیہ اور اس کی اخلاقی تربیت کا بہترین طریقہ ہے۔انہیں شہید اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ وہ خدمت خلق کررہے تھے۔ ان کا گناہ سلوک قرآنی' کا مستقل مزاج راہرو ہونا تھا اور اس راہ میں ایسے مشکل مقام آتے ہی ہیں۔ پریشان کن امر یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں ڈاکٹر نذیر شہید پیدا ہونا بند ہوگئے ہیں چونکہ جماعت نے فاسد قیادت کے خلاف سیاسی کشمکش' کی لو شاید مدھم کرلی ہے۔ضرورت اس طرف توجہ دینے کی ہے''۔

البرہان

ہم نے مارچ کے شمارے میں اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کر دی ہے اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ سردار عالم خاں صاحب اور ان کے ہم نوا (مثلاً ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب نے مارچ ۲۰۱۲ء کے قومی ڈائجسٹ میں ایک مضمون اس حوالے سے لکھا ہے) اگر یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ جماعت کی سیاسی جدوجہد کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں اور اگر کوئی وسعت فکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری تجاویز بھی غور کرے تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ بالآخر ہم سب کا دردِ تو مشترک ہے کہ اس ملک میں جماعت اسلامی اور دیگر دینی قوتیں کامیاب ہوں تاکہ مسلمانوں کا ہر فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اور معاشرہ و ریاست اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے لگے تاکہ زمین پر اللہ کا دین غالب ہو اور مسلمان آخرت میں اللہ کے حضور سرخرو ہوں۔

تبصرہ کتب ڈاکٹر محمد امین

ہماری تعلیمی زبوں حالی۔ اسباب اور تدارک

تالیف: سعید الحق جدون

فاضل مؤلف جامعہ حقانیہ (اکوڑہ خٹک) کے فارغ التحصیل ہیں (تاہم اپنے نام کے ساتھ مولانا نہیں لکھتے)۔ ان کی اس تصنیف کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے دینی مدارس کی تعلیم اور جدید تعلیم دونوں کے نقائص اور خامیوں کی نشان دہی کی ہے اور اصلاحی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ کتاب دو ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلے باب میں عصری تعلیم اور دوسرے باب میں دینی تعلیم کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور موثر ہے۔ وہ فلسفے اور گہرائی میں نہیں گئے بلکہ تعلیمی مظاہر پر گفتگو سے اپنی بات آگے بڑھاتے ہیں۔

انہوں نے کتاب طباعت سے پہلے دینی تعلیم کے ایک فاضل استاذ اور ایک یونیورسٹی پروفیسر صاحب کو دکھائی جس سے وہ یقیناً مفید ہو گئی ہے البتہ کسی صاحب نے ان کی 'پٹھانی اردو' کو درست کرنے

کی زحمت نہیں کی جو کتاب پڑھنے کے دوران کھٹکتی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ مصنف کی مادر علمی کے سربراہ اور معروف عالم دین اور سیاست دان مولانا سمیع الحق صاحب نے لکھا ہے لیکن جو مسائل مصنف نے اٹھائے ہیں، ان پر مثبت یا منفی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کتاب کا دیباچہ پروفیسر اظہار الحق صاحب گورنمنٹ کالج لاہور نے لکھا ہے اور مصنف کے خیالات کو سراہا ہے۔

اگرچہ بعض معلومات اصلاح طلب ہیں (مثلاً دفاع پر پاکستان کا ۸۵ فی صد بجٹ خرچ ہوتا ہے ص ۱۲) لیکن اس کے باوجود کتاب مفید ہے اور تعلیمی حلقوں کے لیے باعث دلچسپی ہونی چاہیے۔ ۱۶۰ صفحات کی اس کتاب پر قیمت درج نہیں۔